فیضانِ رومیؒ

مولانا جلال الدین رومیؒ کی سوانح، مجالس، حکایات وارشادات وملفوظات
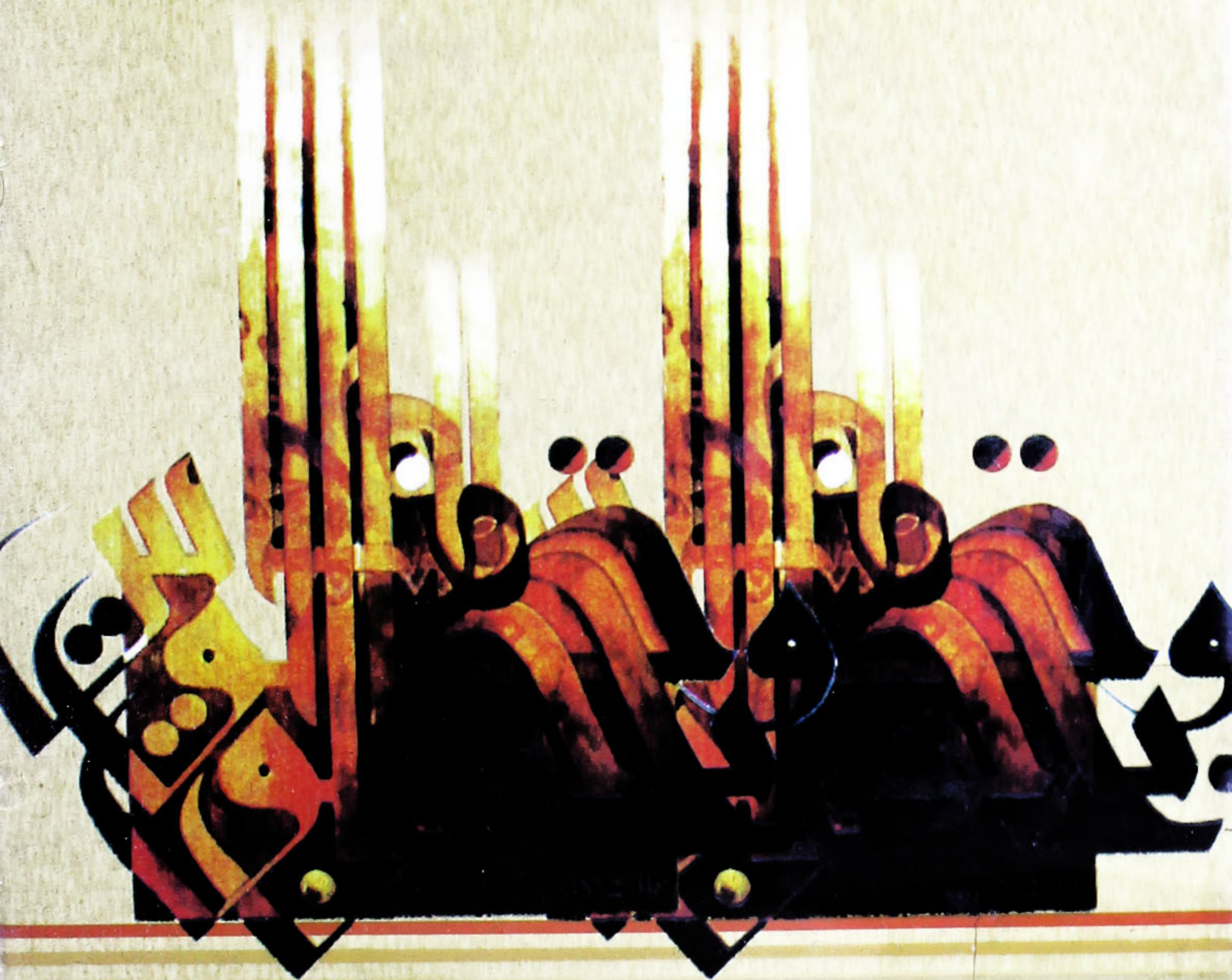
تحقیق و ترتیب: محمد شبیر قمر

کتاب	فیضان رومیؒ
تحقیق وترتیب	محمد شبیر قمر
اشاعت	2009ء
مطبع	حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور
اہتمام	عبید اللہ چوہدری
برائے	یو پبلشرز لاہور
قیمت	250/-

لیگل ایڈوائزر

قیصر زمان ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

ایکس انکم ٹیکس آفیسر

بی اے، ایل ایل بی، ایل ایل ایم (لندن)

ڈی۔ای۔ایل (پنجاب یونیورسٹی)

انتساب

صاف باطن اور صاحبِ نظر اہل اللہ سے سچی عقیدت
رکھنے والے اپنے دوست اور عزیز بھائی

محترم جناب **فصیح الدین اشرف** صاحب
(پولیس سروسز آف پاکستان)

کے نام

فہرست

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

مولانا رومؒ کے ارشاداتِ عالیہ وملفوظاتِ حکیمہ 184

مقدمہ

مولانا جلال الدین محمد رومیؒ عالم اسلام کی ایک نابغہ شخصیت ہیں۔ ممتاز مستشرق ای جی براؤن آپ کی عظمت و کمال کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ: ''آپ خاکِ ایران سے اٹھنے والے ایک نہایت ممتاز صوفی شاعر ہیں اور آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ''مثنوی معنوی'' دوامی حیثیت کی عظیم نظموں کو شمار کیے جانے کی حق دار ہے''۔ پروفیسر نکلسن جو کہ ایک دوسرے بڑے عالمِ مشرقیات ہیں انھوں نے بھی ایک جگہ لکھا ہے:

''مولانا رومؒ ہر زمانے کے صوفی شعراء میں سب سے عظیم ہیں۔ حکیم الامت شاعرِ مشرق علامہ اقبال بھی ان کی بلند علمی شان کے معترف ہیں، اپنے عہد میں حضرت اقبال نے اس بات کی خواہش کی کہ اُن کا عہد ایک مولانا رومیؒ کا محتاج ہے، جو لوگوں کے قلوب میں اُمید کی ایک نئی قندیل روشن کر سکے اور زندگی کی رگوں میں جذبوں اور ولولوں کا تازہ خون دوڑا سکے۔''

مولانا رومی درحقیقت ایک عہد آفرین شخصیت ہیں کہ جن کے علم و دانش اور فکر و فن سے کئی زمانے اثر پذیر ہوئے۔ نثر اور شاعری میں آپ کی حکیمانہ تعلیمات اسرار و رموز کا ایک بے مثال گنجینہ اور حکمت و دانش کا بے نظیر خزینہ ہیں۔

مولانا رومؒ کا عہد غیر معمولی طور پر پُر آشوب تھا۔ غلامی اگرچہ چند ہی دنوں کی ہو انسان کی بہترین صلاحیتوں کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہے اور مولانا کے عہد میں منگولوں کی غلامی تو درحقیقت ایک بدترین عذاب کی صورت میں مسلمانوں پر مسلط تھی۔

اس زمانے میں مسلمانوں اور اسلام کو بڑے چرکے سہنے پڑے اور وہ نقصانِ عظیم سے دوچار ہوئے۔ ان دنوں بغداد مسلمانوں کا ایک اہم مرکز تھا جبکہ مسلمانوں کے اس باہمی اتحاد و یگانگت کے مظہر ''بغداد'' کا سقوط ان کی مرکزیت اور یگانگت کے لیے ضرب کاری ثابت ہوا۔ ارباب علم و فضل گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اس طرح کے تحت سیاسی دباؤ کے زمانے میں شخصی تحفظ بھلا کیوں کر میسر آ سکتا تھا اور معاشی تحفظ کا تو سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایران موت و حیات کی کش مکش میں تھا۔ اس کی معاشی صورتحال افسوس ناک ہو چکی تھی۔ پوری قومِ فارس ایک بلائے ناگہانی کی سنگین چٹان تلے دبی کراہ رہی تھی۔ یہ تاریخ کے متناقض حقائق میں سے ایک حقیقت ہے کہ جن دنوں ایران سیاسی انحطاط و ادبار کا شکار تھا، ان دنوں وہاں کی ادبی و علمی صورتحال پورے عروج اور شباب پر تھی۔ زبانِ فارسی کے عظیم اور آفاقی شہرت کے حامل شعراء میں سے شیخ سعدیؒ، شیخ عطارؒ، اور مولانا رُوم علیہ رحمہ منگولوں کی یلغار کے دنوں میں بقیدِ حیات تھے۔ مسلمانوں نے جس ہمت اور عزم و حوصلے سے اس آفتِ بے پایاں کا مقابلہ کیا وہ لائق تحسین و آفرین ہے۔ پریشانیوں کے اس زمانے میں مسلمان نہ صرف منگولوں اور عیسائیوں سے نبرد آزما تھے بلکہ ایک تیسرے مکّار و عیار دشمن سے بھی برسرِ پیکار تھے اور یہ چھپا ہوا دشمن مارِ آستین بن کر اندر ہی اندر سے زہر گھول رہا تھا جسے دنیا حسن بن صباح کے نام سے جانتی ہے۔

ان مایوس کن اور پراگندہ حالات میں مسلم معاشرے کے مردہ جسم میں روح پھونکنے کے لیے مولانا روم علیہ الرحمہ کے نام گرامی کا قرعہ نکلا اور مولانا نے ملّتِ اسلامیہ کی جانکنی کے عالم میں اپنے جان فزا کام کا آغاز کیا۔ آپ کے ہاتھوں انجام پانے والا احیا نہایت حیرت انگیز تھا۔ اس لیے کہ اس تیرھویں صدی کے ابتدائی عشرے میں اسلام اور ملت اسلامیہ چاروں طرف سے محصور ہو چکے تھے۔ مشرق میں وحشی منگولوں کے گھڑ سوار تیر اندازوں اور مغرب میں زرہ بکتر سے آراستہ و پیراستہ صلیبی جان فروشوں نے انھیں گھیرا ہوا

تھا۔ یہ گھراؤ بظاہر یہی بتا رہا تھا کہ اب مسلمان اور اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو جائیں گے، لیکن ربِ قدیر کی قدرتوں کے رنگ نرالے ہیں، اسی صدی کے آخری حصے میں صورتحال کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ وہ اس طرح کہ آخری صلیبی سپاہی کو بھی پکڑ کر سمندر کی بے کراں وسعتوں میں پھینک دیا گیا تھا۔ اگرچہ اِل خاں کے سلسلے کے کئی حکمران عیسائیت سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ لیکن ان کے ساتویں حکمران نے آخر سرکاری مذہب کی حیثیت سے اسلام کو قبول کر لیا اور یہ دینِ اسلام کی درحقیقت ایک نہایت یادگار اور درخشندہ فتح تھی۔

کفر و ضلالت کی آندھیوں پر اسلام اور مسلمانوں کی اس بے مثال فتح کے لیے مولانا رومیؒ کی بلا ریب نہایت نمایاں خدمات ہیں۔ اس عہدِ یاس و نا اُمیدی میں مولانا ایک بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی کی طرح کھڑے دکھائی دیتے ہیں جبکہ آپ سے پہلے کے اور آپ کے بعد میں آنے والے شعراء آپ کے مقابلے میں یوں لگتے ہیں کہ جیسے وہ اسی فلک بوس پہاڑ کے دامن میں فروکش ہوں۔ مولانا کی قائم کردہ روایات آپ کے افکار اور آپ کی زبان نے آنے والی صدیوں پر نہایت گہرے اور نتیجہ خیز اثرات مرتب کیے۔ مولانا کے بعد آنے والے ہر ایسے صوفی نے جسے فارسی زبان کی شُد بُد تھی، اپنے آپ کو مولانا کا مرید اور مولانا کو اپنا ہادی و مُرشد تسلیم کیا ہے۔

مولانا درحقیقت ایک ایسے عظیم المرتبت باپ کے سپوت تھے جو اپنے دینی علم کے لیے مشہور اور اپنی روحانی بزرگی کے لیے خاصے قابلِ احترام تھے۔ ان کا عہد یونان کے فلسفیانہ افکار اور ان افکار کے اثرات کے خلاف بغاوت و سرکشی کا عہد تھا۔ آپ کے والد محترم حضرت بہاؤالدین محمد رحمہ اللہ علیہ کا زمانہ حقیقت میں امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ ہم سب پر یہ بات عیاں ہے کہ امام غزالیؒ ایسے علمی اور پر تاثیر دین کے حامی تھے جو انسانوں کو متکلمانہ عقائد سے نجات دلائے اور قرآن و سنت کے ساتھ ان کا عملی ربط و

ضبط استوار کرے۔ چنانچہ مولانا رومؒ ایک ایسے خانوادے میں پیدا ہوئے جو اعلانیہ طور پر فلسفے سے نبرد آزما تھا۔ اُن کا گھریلو ماحول عالمانہ اور صوفیانہ اقدار کا حامل تھا۔ ان کے والد گرامی ایک بلند مرتبت صوفی تھے اور انھیں اپنے صوفیانہ مشرب کے لیے متعدد مشکلات و مصائب کا سامنا رہا۔ لیکن انھوں نے نہایت پامردی اور عزیمت کے ساتھ اپنے مؤقف کی حمایت جاری رکھی۔ ایسے ہی ماحول میں مولانا رومؒ نے بھی اقتدار سے بغاوت اور اصولوں کے لیے جان چھڑکنے کا سبق سیکھا کہ اس کے بغیر انسان کا روحانی مقام و مرتبہ حیوانیت کی سطح سے بلند نہیں ہوسکتا۔ اسی فضا میں مولانا رومؒ نے مصائب و شدائد کے مقابلے میں اللہ رب العزت کی ذات اقدس پر توکّل اور بھروسے کا سلیقہ سیکھا اور اِسی پر انتشار ماحول میں انھوں نے انسانی تشدد اور معاشرتی تہذیب کی پیدا کردہ سب مزاحمتوں کے باوجود اپنے فرائض کی ادائیگی کی قدر و قیمت کا ادراک کیا۔

مولانا رومیؒ کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے والد کا کردار نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ جنھوں نے اپنے عہد کے ایک فاضل اور معتمد شخص اور اپنے مرید برہان الدین محقق ترمذی کو اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا۔ برہان الدین محقق مولانا روم کے استاد اور اتالیق تھے۔ یہ صاحب بلخ میں مولانا رومؒ کے والد کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے اور ایک مخلص مرید کے طور پر مولانا کے والد کے دل میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ مولانا کے والد نے بلخ سے ہجرت کرنے سے پہلے ہی برہان الدین محقق کو مولانا روم کی اتالیقی کی ذمہ داری سپرد کی تھی۔ رومی کے اتالیق کے طور پر برہان الدین محقق کے انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی نظروں میں کتنی وقعت اور عزت رکھتے تھے۔ مولانا رومؒ نے اپنے زمانے کی عمدہ روایات کے پیشِ نظر اپنے استادِ گرامی کے قدموں میں بیٹھ کر محبت اور فرض شناسی کے جذبے سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا نے اپنی محنت اور مخلصانہ جذبے سے نہ صرف مقررّہ نصاب کی کامیابی سے تکمیل کی بلکہ اس کے علاوہ بھی علم و فضل کے دائرے میں بہت کچھ

حاصل کیا کیونکہ حسن اتفاق سے انھیں ایک ایسے مربی اور استاد میسر آ گئے تھے جو فاضل بھی تھے اور مخلص بھی۔

اپنے والد کی وفات کے بعد تقریباً چوبیس سال کی عمر میں مولانا رومؒ اپنے والد کے جانشین مقرر ہوئے۔ اس وقت ان کے استاد برہان الدین محقق قونیہ میں سکونت گزیں نہیں تھے بلکہ انھیں اپنے مرشد کی وفات کا علم ہی نہ ہو سکا۔ تاہم ان کی وفات کے ایک سال بعد جب وہ قونیہ آئے تو مولانا رومؒ اپنے والد کی مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ استاد نے یہاں آ کر اپنے شاگرد مولانا روم کو مادی علوم میں کامل پایا۔ اب انھوں نے مولانا روم کو باطنی علوم کا وہ قیمتی ذخیرہ منتقل کرنا چاہا جو انھوں نے مولانا رومؒ کے والد اور اپنے پیر و مرشد سے حاصل کیا تھا۔ اس موقع پر کامل نیازمندی سے کام لیتے ہوئے مولانا روم نے بھی اپنے آپ کو کامل طور پر اپنے استاد کی سپردگی میں دے دیا اور یوں تقریباً نو سالوں تک اکتساب فیض کرتے رہے۔ اپنے استاد کی خواہش پر مزید تعلیم کے حصول کے لیے مولانا روم حلب کے مدرسہ حلاویہ میں بھی داخل ہوئے۔ اور حلب سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا روم دمشق تشریف لے گئے جہاں انھوں نے چار برس قیام کیا اور مختلف علوم وفنون کا اکتساب کرنے کے بعد واپس قونیہ آ کر اپنے آپ کو پوری طرح سے اپنے استاد گرامی برہان الدین محقق کی نگرانی میں دے دیا ان دونوں برہان الدین اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں تھے۔ انھوں نے اب مولانا روم کو ایک صد بیس دنوں یعنی تین چلوں کی ریاضت کا حکم دیا۔ اس ریاضت ومجاہدے کی کامیاب تکمیل پر اُن کے استاد کی خوشی کی کوئی انتہاء نہ رہی کیونکہ اب مولانا نے تزکیۂ نفس حاصل کر لیا تھا۔ اس پر آپ کے استاد گرامی نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور خوشی خوشی مولانا رومؒ کو اپنے سینے سے لگا کر محبت وشفقت بھرا بوسہ دیا اور ان سے کہا کہ تم معقولی، منقولی، رسمی، روحانی اور اکتسابی علوم میں تو بے مثل و یکتا تھے ہی اب سرّی اور باطنی علوم میں بلند درجے کے رمز شناس ہو چکے ہو۔ اس پر انھوں نے مولانا روم پر گم کردہ راہ

انسانوں کی رشد و ہدایت اور رہبری کی ذمہ داری ڈالی اور یوں مولانا رومی اپنے والد کی مسند درس ارشاد پر پورے طور پر متمکن ہو گئے۔

چونتیس سال کی عمر میں مولانا روم ایک مسلمہ رہبر و رہنما اور ایک حقیقت شناس مربی کے درجے پر فائز ہو چکے تھے۔ اب آپ کی زندگی ایک راسخ العقیدہ فاضل استاد کی زندگی کا نمونہ بن چکی تھی اور آپ بڑے بڑے مجمعوں میں مذھب، فلسفے، فقہ اور اخلاقیات پر درس دیا کرتے تھے۔ مولانا کی زندگی سادگی کے ساتھ ساتھ گہرے اور با مقصد مطالعے کا نمونہ تھی اور ان کی تقریر اپنے اندر بے حد دل نشینی، اثر آفرینی رکھتی تھی اور یوں ایک خلقت ان سے اکتساب فیض کیا کرتی تھی۔

مولانا رومی کی عمر اس وقت سینتیس (۳۷) برس کی تھی جب حضرت شمس تبریزی رحمتہ اللہ علیہ ان کی زندگی میں داخل ہوئے۔ اس سینتیس سالہ حیاتِ مبارکہ میں کوئی ایسی شہادت میسر نہیں آتی کہ مولانا روم کو شعر و شاعری سے کوئی دلچسپی رہی ہو۔ لیکن حضرت شمس تبریزیؒ کی آمد کے ساتھ ہی گویا شعر و نغمے کا مقفل دریچہ کھل گیا۔ شمس تبریزی کے اثر سے رومی کے تغزل کا چراغ جل اٹھا اور شعر و نغمے کا چشمہ جاری ہو گیا۔ اور یہ اثر اس قدر شدید اور گہرا تھا کہ اس نے مولانا روم کو کم و بیش سترہ برس تک سہارا فراہم کیے رکھا۔ اس عرصے میں مولانا نے زیادہ تر غزلیں ہی کہی ہیں اور اُن کی ان غزلیات پر مشتمل ان کا دیوان اپنی ضخامت کے اعتبار سے بھی بلند درجہ رکھتا ہے اور اپنے مواد کے لحاظ سے بھی نہایت ارفع و اعلیٰ ہے اور یہ دیوان ان کی شہرہ آفاق ''مثنوی معنوی'' کا پیش رو قرار پاتا ہے۔ مولانا روم نے اپنی غزلیات کے دیوان کو ''دیوانِ شمس'' کے نام سے موسوم کیا اور اپنی معروف و بلند پایہ مثنوی کو ''حسامی نامہ'' کا نام دیا۔ شمس تبریزؒ مولانا کے دیوان کے ہیرو ہیں جبکہ حسام الدین چلپیؒ ان کی اس بے نظیر مثنوی کے محرّک قرار پاتے ہیں۔ حسام الدین چلپی کی ترغیب و تشویش ہی مثنوی کی تحریر کا باعث بنی تھی اور مولانا نے کم و بیش بارہ سال تک ان کو پچیس ہزار سات صد (۲۵,۷۰۰) ہزار شعر املا کرائے تھے۔

مولانا رومؒ کی شاعری اور تفکر کا موضوع اور مخاطب حضرت انسان ہے۔ وہ انسان جو لافانی اور لازوال ہے اور مولانا اس انسان کے لیے کہ جو بلندی و رفعت کی گراں بہا سرفرازیاں حاصل کر سکتا ہے، وہ ایسے ہی انسان کے لیے حسن و محبت کے نرم و ملائم اور شیریں نغمے الاپتے ہیں۔ اور اس راہ کی جانفشانیوں اور دل سوزیوں کے کٹھن مرحلوں میں اسے حوصلے اور عزیمت کی راہ اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ رومی کی شاعری غم رسیدہ اور شکستہ دل لوگوں کے لیے باعثِ سکون و ثبات ہے۔ جب بڑے بلند مرتبت مسیحاؤں اور اطبا کی مساعی بے نتیجہ قرار پاتی ہیں تو رومی کا ایک ایک لفظ اپنی مسیحائی کے کرشموں سے سکون و راحت کا سرمدی دریچہ وا کر دیتا ہے۔ مولانا روم ایک مشفق و مہربان دوست اور شفقت و کریمی کے مجسمے ایک رفیق کار کی طرح ہر نوع کے دکھ درد اور غم و مصیبت میں شریک کار رہتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنی زندگی محبت کے لیے وقف کر رکھی تھی جو اس دکھوں بھری کائنات میں انسان کے لیے امن و سلامتی، صلح و آشتی، فارغ البالی و خوشحالی، آسودگی اور سرفرازی، سربلندی کا پیغام لاتی ہے اور انسان کی حیات روحانی میں طمانیت، تنویر کا سامان فراہم کرتی ہے۔

مولانا رومؒ کے افکار و تعلیمات میں عشق و محبت کو گراں قدر اہمیت دی گئی ہے۔ شعور سنبھالنے کے بعد ان کی زندگی کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ کوئی نہ کوئی فرد ان کی عقیدت و محبت کا مرجع نہ رہا ہو۔ ابتدائی دور میں ان کی ساری عقیدتوں اور محبتوں کا مرکز و محور برہان الدین محقق تھے جو ان کے استاد و اتالیق بھی تھے۔ دوست اور ساتھی بھی۔ دوسرے دور میں مولانا کامل طور پر شمس تبریزؒ کی گرفت میں تھے۔ شمس کی ذات ان پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی کہ وہی تنہا مولانا روم کی توجہات کی مرکز قرار پائی تھی۔ اس دور میں ربط و ضبط کے سبھی بندھن یکسر ٹوٹ گئے تھے اور یہی زمانہ مولانا کی زندگی کا سب سے زیادہ پُر جوش، ہنگامہ خیز اور تخلیقی حیثیت سے مالا مال دور تھا۔ اس کے بعد جب مولانا روم کے اوسان بحال

ہوئے اوران کو کسی قدر سکون وطمانیت میسر آئے تو اعتماد ومحبت اب صلاح الدین زرکوب کی صورت میں ڈھل گئے۔ ان کی وفات کے بعدان کی جگہ حسام الدین چلپی نے لے لی۔ مولانا کا فلسفہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے دوستی اور رفاقت نہایت ضروری ہے اس لیے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے افکار سے زندگی کے لیے حرارت اور توانائی اخذ کرتا ہے اور یہ کہ ایک فانی انسان سے دوستی اگر انسان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل اور نشوو ارتقاء میں معاون ثابت ہوتی ہے تو پھر خالق کائنات سے محبت اور دوستی کا تعلق بھی انسانی زندگی میں نیکی اور رفعت و سربلندی کی صفات پیدا کرنے میں بے حد مؤثر ثابت ہوسکتا ہے۔ مولانا روم اپنی تعلیمات میں اس دوستی کے قیام و بقاء کے لیے پیہم کوشش اور صبر کی روش اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں۔

مولانا روم کی زندگی درحقیقت متضاد و متبائن حقائق کا ایک آئینہ خانہ ہے اور یہ حقائق ان کی ارتقاء پذیر شخصیت میں بڑی دل کشی سے تحلیل ہوکراس سے ہم آہنگی اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے ایک مرحلے میں مولانا موسیقی کو ناپسند اور مضر رساں قرار دیتے تھے لیکن پھر ایک وقت بھی چشم فلک نے دیکھا کہ مولانا موسیقی کے شیدائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح ان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا کہ وہ شعراء اور شعروشاعری کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب مولانا سینۂ کائنات پر فارسی زبان کے ایک بلند مرتبت شاعر کے طور پر ابھرے۔ اب اس مرحلے میں اپنی ذات کی تربیت وتہذیب کے لیے اس عطیۂ ربانی سے دستبرداری اختیار کر لینے کی بجائے اس صلاحیتِ خداداد سے انسانیت کی کوئی بہت بڑی خدمت بجالاتے۔ مولانا روم اپنی اس شاعرانہ صلاحیت کو خداداد عطیۂ خیال کرتے تھے اور اسے اپنی ریاضت اور اپنی مساعی کا ثمرہ نہیں قرار دیتے تھے۔ اس خداوندی انعام کو وہ اپنے پاس رب کریم کی امانت سمجھتے تھے اور اس کے ذریعے سے وہ لوگوں کو فلسفۂ یونان کی پیچیدگیوں سے نکال کرانھیں امید اور مسرت کی نوید دینا چاہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ فکر اور عمل کے مابین موجود رشتے کو استوار کرنے کے آرزومند تھے۔ آپ اپنے شعر و سخن کی لطافتوں اور نزاکتوں سے کام لے کر اخلاقِ فاضلہ کی تکمیل اور معرفت و محبت کی قندیل روشن کر دیتے ہیں۔ مولانا روم عشق کو ایک آفاقی جذبے اور کائناتی احساس کے طور پر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں منطق و استدلال بے دست و پا قرار پاتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے وہاں عشق بے خوف و خطر جان کی بازی لگا دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق چونکہ لذت و اذیت اور انعام و سزا سے ماوراء اور بے نیاز ہے، اس لیے آپ اسے عقل پر فائق و برتر خیال کرتے ہیں۔ عقل اپنی افادیت اور اہمیت کے باوجود حیات و کائنات کے معموں کی عقدہ کشائی کرنے میں ناکام ٹھہرتی ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا شرف محض عشق ہی کے حصے میں آتا ہے اور اسی لیے مولانا روم کے نظامِ فکر و نظر میں عشق کو ایک بنیادی نکتے کی حیثیت حاصل ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مولانا رومؒ کا مطالعہ بالعموم شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کے اسلوبِ فکر کے تناظر میں کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال ایک وسیع المطالعہ عبقری انسان تھے۔ ان کے استاد سید میر حسن نے اقبال کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کیا۔ اسی طرح آپ کے مغربی نژاد استاد پروفیسر آرنلڈ نے بھی آپ کے ذوقِ مطالعہ کو جلا بخشی۔ مولانا روم سے چھ صدیاں بعد میں پیدا ہونے والی یہ عہد ساز شخصیت بھی انہی حالات و مسائل سے دوچار ہوئی جو اپنے عہد میں مولانا رومؒ کو درپیش تھے۔ اور علامہ اقبال ان مسائل کا حل قرآن حکیم اور مثنوی مولانا رومؒ کو قرار دیتے تھے۔ اسی لیے حضرت علامہ اقبال نے قرآنِ حکیم کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اوائل عمر سے ہی مثنوی مولانا رومؒ کا مطالعہ بھی تسلسل سے جاری رکھا اور اقبال سمجھتے تھے کہ مولانا کی مثنوی میں بھی قرآن حکیم کے معارف و نکات ہی بیان ہوئے ہیں۔ گویا مولانا رومؒ نے قرآن مجید کی حکمت و دانش اور معارف و اسرار کو فارسی زبان میں بیان کر دیا ہے۔ اور مولانا کے سینے کو قرآنی معارف و حکم کا گنجینہ قرار دیتے تھے۔ ان کے

نزدیک مولانا روم اگرچہ اللہ کے فرستادہ پیغمبر تو نہیں ہیں لیکن وہ اپنے افکار کے ذریعے پیغمبرانہ مشن کو ہی آگے بڑھا رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے مرشد رومیؒ سے مرد کامل، موت سے بے خوفی، خودی اور خود شناسی، امید پرستی، شرف انسانیت کے تصورات اخذ کیے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ''رومیؒ کے کلام کو اقبال نے اس طرح اپنے مزاج میں سمولیا ہے کہ رومی کا طرز اظہار بعض اوقات، اقبال کے اظہار و بیان کا جزو بن جاتا ہے۔''

مولانا رومؒ سے علامہ اقبال کی عقیدت و شیفتگی کا والہانہ اظہار ان کی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں ہوتا ہے، جہاں وہ مولانا رومؒ کی رہبری میں عالم افلاک کی سیر و سیاحت کرتے ہیں اور مولانا روم کی صحبت و رفاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حقائق و معارف اور دانش و بصیرت کے خزینوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اور اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں جیسا کہ ان کا حسب ذیل شعر اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے:

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مولانا روم کی شخصیت اور ان کے فکر و پیغام سے مشرق و مغرب اور عرب و عجم سبھی متاثر ہوئے۔ مغرب کے ارباب علم نے آپ کو بے پایاں خراج تحسین پیش کیا اور آپ کی شاعری اور نثر میں پیش کیے گئے آپ کے افکار کو انھوں نے مغرب میں پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ایک مدبر و حکیم اور بلند پایہ فلسفی صوفی کی حیثیت سے آپ کا نام مشرق و مغرب میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، آپ درحقیقت مسلمانوں کے مربی اور مرشد اور ہادی و رہنما تھے اس لیے مسلمانوں نے بھی آپ کے افکار کی ترویج و اشاعت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عالم عرب میں بھی آپ کی فکر کو عام کیا گیا اور عجمی مسلمانوں نے بھی اس فریضے کی ادائیگی میں کسی کسر نفسی سے کام نہیں لیا۔

آپ کی تصنیف لطیف ''مثنوی'' درحقیقت علوم، معارف اور حکمت و دانش کا ایک

گراں بہا خزینہ ہے۔ مسلمان علماء کی علمی مجلسوں اور عوام الناس کی محفلوں میں آپ کی اس شہرہ آفاق تصنیف کا چرچا یکساں ہے اور سب اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے اخذ واکتساب کرتے رہتے ہیں۔

برصغیر پاک وھند میں آپ کی علمی وروحانی عظمت کا پورے طور پر اعتراف کیا گیا اور آپ کی شخصیت اور پیغام کا شہرہ ہر مسلمان گھر میں ہوتا ہے۔ کون ایسا مسلمان ہوگا جس نے مثنوی معنوی کے خالق مولانا جلال الدین محمد المعروف مولانا رومؒ کا نام نامی نہیں سن رکھا ہوگا۔

برصغیر پاک وھند کے عظیم المرتبت ادیب، محقق، مورخ اور سیرت نگار مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنے مشہور سلسلہ تصانیف میں صوفیائے کرام میں سے مولانا روم کی ذات گرامی کا انتخاب کیا اور ''سوانح مولانا روم'' کے عنوان سے ان کے سوانح اور علمی خدمات پر مشتمل ایک وقیع اور مبسوط علمی تصنیف ارباب علم کی خدمت میں پیش کر کے خراج تحسین وصول کیا۔ علامہ اقبالؒ کی مولانا سے عقیدت اور شیفتگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ان کے توسط سے بھی مولانا نہ صرف برصغیر پاک وھند میں بلکہ پورے اقصائے عالم میں متعارف ہوئے۔

مولانا نے اپنی مثنوی میں قرآن مجید کے طرزِ استدلال کی پیروی کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں مولانا رومؒ کے کلام کی بے ساختگی، سادگی، کشش، دلکشی، اور حلاوت وشیرینی انسان کو اپنی سحر میں لے لیتی ہے۔

اس وقت ہم مسلمانوں نے اپنی غفلت وکوتاہی کے سبب اپنے اسلاف کرام سے اور ان کی تعلیمات سے روگردانی کی روش اپنا رکھی ہے۔ جو جواہر ریزے اور رشد وہدایت کے لعل وگوہر انھوں نے اپنے افکار کی صورت میں ہمارے لیے چھوڑے ہم نے ان سے اعراض کیا۔ اپنے اسلاف سے اسی بے اعتنائی کے سبب آج ہم ذلت وپستی اور ادبار وزوال کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنے اسلاف کرام جیسی عظمت وسربلندی اور اور سرفرازی حاصل کرنے کے آرزومند ہیں تو ہمیں آپ کے افکار وتعلیمات سے وابستگی ودل بستگی پیدا کرنی ہوگی۔

اسی احساس کے پیش نظر مولانا رومؒ کے افکار و تعلیمات پر مشتمل یہ کتاب ''فیضان رومی'' کے عنوان سے اہلِ علم کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے تاکہ ماضی کی ہماری بزرگ ان ہستیوں سے ہمارا ٹوٹا ہوا ربط پھر سے استوار ہو جائے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں نہایت مختصر انداز میں مولانا کی سوانحی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں آپ کا حسب نسب، خاندان، پیدائش تعلیم و تعلّم، شمس تبریز سے آپ کی ملاقات اور مفارقت، صلاح الدین زرکوبؒ سے تعلق اور حسام الدین چلپیؒ سے دوستی پر بحث کی گئی ہے۔ آپ کی اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ آخر میں آپ کی علمی خدمات کا نہایت اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے اور بطور شاعر آپ کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا روم کی حکیمانہ مجالس کے زیرِ عنوان ۳۹ مختلف موضوعات پر ان کی بصیرت افروز خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ حکیمانہ مجالس برصغیر پاک و ہند کے صاحب درد حکیم و مربی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم و مغفور کے افادات عالیہ پر مشتمل ہے۔ ان میں حکمت و بصیرت اور موعظت کا وافر سامان موجود ہے۔ اگر پڑھنے والوں کی آنکھیں بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کا نور بھی رکھتی ہوں تو ان کے لیے ان میں بڑی رہنمائی موجود ہے۔

تیسرے باب میں حکایات کے پیرائے میں آپ کے دل آویز اور حلاوت خیز افکار پیش کیے گئے ہیں۔ آج کا قاری اس قدر مصروف زندگی گزار رہا ہے کہ ادق اور مشکل موضوعات کے مطالعے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں اور پھر فارسی زبان سے قومی سطح پر ہماری بے اعتنائی کے سبب اس زبان کا علم و ادب ہمارے لیے رفتہ رفتہ اجنبی ہو رہا ہے۔ اس لیے حکایت کے پیرائے میں عام فہم انداز میں مولانا کی رشد و ہدایت پر مبنی تعلیمات اس باب میں پیش کی گئی ہیں۔

آخری اور چوتھے باب میں آپ کے ارشادات و ملفوظات کی صورت میں آپ کی حکیمانہ فکر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ارشادات آپ کی نثری تالیف ''فیہ ما فیہ'' سے

ماخوذ ہیں اور بقول مولانا شبلی نعمانی مرحوم:

''فیہ مافیہ''ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کے نام لکھے۔''

ارباب علم کے نزدیک یہ کوئی مولانا کی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ آپ کے ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ ہے اور اس میں بیان کردہ مسائل بھی تقریباً وہی ہیں جو مولانا نے اپنی ضخیم ''مثنوی معنوی''میں زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کردیئے ہیں۔اسی طرح آپ کے دیوان میں تغزل کی جو کیفیت ہے وہ بھی ایسے ہی اسرار ورموز سے مملو ہے۔اس طرح یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوکر سامنے آتی ہے کہ مولانا کی مایہ ناز شعری تصنیف مثنوی معنوی اور دیوانِ شمس تبریز کی حقیقی تفہیم کے لیے فیہ مافیہ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔کیونکہ اس کے مطالعے سے مولانا کی فکر کے اساسی تصورات سے بڑی حد تک آشنائی حاصل ہوسکتی ہے۔

مولانا مسلمان اُمہ کی ایک عہد ساز اور زمانہ آفرین شخصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔مولانا ایک جینیئس اور عبقری انسان اور نہایت بلند مرتبت مسلمان مفکر وشاعر تھے۔آپ کے فکر و فن نے ہر عہد اور ہر زمانے کے انسانوں کے دلوں میں عرفانِ حقیقت اور انقلابِ حالات کی صد رنگ شمعیں روشن کی ہیں۔آپ نے اپنے عہد میں بے کرداری و بے عملی، مصلحت کوشی، تغافل وتکاسل، مادیت پرستی اور ظاہرداری وریاکاری کے بتوں کو پاش پاش کیا اور رشد وہدایت اور دین وعرفان کی خالص و بے آمیز مہک اقصائے عالم میں عام کردی۔

مولانا کی ذات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ کتاب ان کے عشاق اور پیروکاروں کی خدمت میں بصد عجز ونیاز پیش کی جارہی ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے اگر کوئی ایک بھی فرد مولانا کی پیش کردہ تعلیمات کا سراغ پا گیا اور یوں صراطِ مستقیم پر چلنے کا راستہ اسے مل گیا تو سمجھنا چاہیے کہ اس کتاب کے پیش کرنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔

اس کتاب کا انتساب اپنے ایک نہایت صاحبِ علم دوست کے نام کیا ہے۔بنیادی

طور پر وہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور اُن کی تحقیق کا اصل میدان (Crimenology) ہے اور اس موضوع پر اُن کے تحقیقی مضامین بین الاقوامی تحقیقی رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔انگریزی زبان میں اس موضوع پر ایک نہایت وقیع کتاب بھی چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے۔امریکہ، جاپان اور دنیا کے کئی ایک ممالک میں اس موضوع پر لیکچر کے لیے انھیں مدعو کیا جاتا ہے۔میڈیکل سائنسز کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پولیس کے شعبے کو جوائن کیا۔قانون کی تعلیم بھی حاصل کی ہے۔فارسی، عربی، انگریزی اور اپنی مادری زبان پشتو کے ادب پر کافی گہری نظر رکھتے ہیں۔پاکستان کے ادبی رسائل میں بھی ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔علم وادب سے اُن کی وابستگی کے ساتھ ساتھ اہل اللہ کے ساتھ بھی خصوصی شغف رکھتے ہیں۔فارسی شعروادب کا سلجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں۔اسی نسبت کے پیش نظر اس کتاب کا انتساب اُن کے نام کیا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز اس حقیر علمی کاوش کو اپنی بارگاہ صمدیت میں شرفِ قبولیت سے سرفراز فرمائے۔اسے اہلِ علم اور عامتہ الناس سب کے لیے نافع بنائے۔آمین

دعاؤں کا طالب

محمد شبیر قمر

حبیب پارک نزد منصورہ لاہور

باب اوّل

مولانا رومؒ کی مختصر سوانح اور علمی خدمات

نام و لقب:

نام محمد، لقب جلال الدین اور عرف مولانائے روم تھا۔

جائے ولادت:

مولانا رومؒ کی جائے ولادت بالاتفاق بلخ ہے۔

سالِ ولادت:

مولانا کا سالِ ولادت تمام تذکرہ نگاروں نے ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۸ء لکھا ہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اس سال ۶ ربیع الاول کو پیدا ہوئے۔

خاندان:

مولانا رومؒ کا شجرہ نسب سات واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

ابوبکر صدیقؓ

|

عبدالرحمٰن

|

مولانا روم کے والد کا نام بھی محمد تھا اور لقب بہاؤالدین تھا۔ ان کا وطن بلخ تھا۔ اپنے علم وفضل اور تقویٰ کی وجہ سے ان کا شمار اس دور کے سرآمد روزگار پیشوایانِ دین میں ہوتا تھا۔ بہاؤالدین کی والدہ سلطان محمد خوارزم شاہ کی بیٹی تھی۔ اس لحاظ سے مولانا رومؒ کے خون میں شاہی خون بھی شامل ہو گیا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مولانا کے دادا حسین بھی ایک صاحب حال بزرگ تھے اور یہی وجہ تھی کہ سلطان محمد خوارزم شاہ جیسے پر ہیبت اور صاحب جاہ وجلال بادشاہ نے ان کو اپنا داماد بنانے میں فخر محسوس کیا۔ مولانا بہاؤالدین ایک

سحر البیان خطیب تھے۔سلطان محمد خوارزم شاہ یوں تو مولانا بہاؤالدین کا معتقد تھا اور گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا لیکن عوام الناس میں ان کی بے پناہ مقبولیت کو دیکھ کر اس کے دل میں کچھ بدظنی سی پیدا ہوگئی۔مولانا اس کے وسوسہ کو بھانپ گئے اور بلخ سے ہجرت کر کے ۶۱۰ھ میں نیشا پور پہنچے اور پھر وہاں سے بغداد تشریف لے گئے، وہاں مدتوں قیام رہا اور ہزار ہا لوگ ان کے علم وفضل سے مستفیض ہوئے۔چند سال بعد ان کا دل بغداد سے اچاٹ ہوگیا اور وہاں سے براہ حجاز شام وزنجان ''آق شہر'' پہنچے، یہاں ایک سال قیام کیا اور پھر لارندہ جا کر سکونت اختیار کر لی۔وہاں ان کے قیام کو سات برس گزر گئے تو ارضِ روم (ایشیائے کوچک) کے سلجوقی فرماں روا علاؤالدین کیقباد نے ان کو بہ اصرار قونیہ آنے کی دعوت دی۔شیخ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور لارندہ سے قونیہ کو روانہ ہوئے۔
قونیہ کے باہر سلطان علاؤالدین کیقباد نے بڑی شان وشوکت اور گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کے گھوڑے کے ساتھ پیادہ پا چل کر انھیں شہر کے اندر لے کر آیا پھر ایک عظیم الشان مکان ان کی رہائش کے لیے وقف کردیا اور آرام وفراغت کے تمام لوازم مہیا کر دیے۔سلطان اکثر مولانا رومؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور فیضِ صحبت اٹھاتا تھا۔
جب شیخ بہاؤالدین کو قونیہ میں قیام کیے ہوئے تین برس گزر گئے تو وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ کو جمعہ کے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔اس وقت مولانا رومؒ کی عمر چوبیس برس کی تھی۔چھ سات برس پہلے جب وہ اپنے والد کے ساتھ لارندہ میں مقیم تھے ان کی شادی ہو چکی تھی۔بیوی کا نام کرزا خاتون تھا۔جو لارندہ کے ایک معزز امیر خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی تھیں۔ایک سال بعد ان کے بطن سے مولانا کے فرزند سلطان وُلد پیدا ہوئے گویا والد کی وفات سے قبل مولانا عیال دار ہو چکے تھے۔

تعلیم وتربیت:

مولانا روم نے ابتدائی تعلیم اپنے عظیم المرتبت والد بہاؤالدین سے حاصل کی۔پھر

والد نے مولانا کو اپنے ایک مرید سید برہان الدین محقق ترمذیؒ کے سپرد کر دیا۔ وہ ایک بلند پایہ عالم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ انھوں نے چند سال کے اندر اندر مولانا کو تمام علوم وفنون میں طاق کر دیا۔

شیخ بہاؤالدین نے جس سال وفات پائی اس سے اگلے سال ۶۲۹ھ میں مولانا رومؒ حلب اور دمشق تشریف لے گئے جو اس زمانے میں ہر قسم کے علوم وفنون کے مرکز تھے۔ مولانا وہاں کئی برس تک مقیم رہ کر تحصیلِ علم کرتے رہے یہاں تک کہ قرآن، حدیث، تفسیر، معقول، منطق، فلسفہ اور دوسرے تمام علوم میں درجہ کمال تک پہنچ گئے۔ تکمیلِ علوم کے بعد مولانا وطن واپس تشریف لائے۔ ان کے استاد سید برہان الدین بھی اپنے وطن ترمذ سے قونیہ آ گئے تھے۔ انھوں نے مولانا کو سینے سے لگا لیا اور پھر نو برس تک ان کو طریقت اور سلوک کی تعلیم دیتے رہے۔ بعض تذکروں میں ہے کہ مولانا ان کے حلقہ ارادت میں بھی داخل ہو گئے تھے۔ تاہم ان پر ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا۔ سماع سے پرہیز کرتے تھے اور اپنا اکثر وقت، درس وتدریس، وعظ وہدایت اور فتویٰ نویسی میں صرف کرتے تھے۔ تا آنکہ ان کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔

شمس تبریزیؒ سے ملاقات:

۶۴۲ھ کا واقعہ ہے کہ ایک دن مولانا روم ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک خستہ حال درویش وہاں آ گیا۔ اس نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کیا کتابیں ہیں؟ مولانا نے کہا: ''چیزے است کہ تو نمی دانی'' یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ درویش نے یہ سن کر آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ساری کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو درویش کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا، کہنے لگے: ''ارے میاں تو نے یہ کیا کیا، ایسی نادر ونایاب کتابوں کو برباد کر دیا۔'' درویش نے مسکرا کر حوض میں ہاتھ ڈالا اور تمام کتابیں پانی سے نکال کر مولانا کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں سے کسی کا ایک

ورق تک نہ بھیگا تھا۔ یہ حال دیکھ کر مولانا سکتے میں آ گئے اور اُس درویش کا منہ تکنے لگے۔ اب اس درویش نے کہا ''چیزے است کہ تو نمی دانی'' یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے ۔۔۔۔۔مولانا بے اختیار درویش کے قدموں میں گر پڑے، درویش نے ان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی دن سے مولانا اس درویش کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے اور ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گیا۔

یہ درویش شمس تبریزؒ تھے۔ وہ فرقہ باطنیہ کے پیشوا ''کیا بزرگ'' کے خاندان سے تھے۔ اور اپنا آبائی مسلک ترک کر کے ایک خدارسیدہ بزرگ بابا کمال جندیؒ کے مرید بن گئے تھے۔ ان کی نگرانی میں حضرت شمسؒ نے بہت جلد طریقت اور سلوک کی منزلیں طے کر لیں اور مرشد کے منظورِ نظر بن گئے۔ انھوں نے عام صوفیوں طرح پیری مریدی کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ سوداگروں کی وضع میں سیاحت کرتے رہے۔ جہاں جاتے تخلیہ میں عبادت کرتے رہے اور عام لوگوں میں خلط ملط ہونے سے احتراز کرتے۔ عبادت سے کچھ وقت ملتا تو اس میں ازار بند بُن لیتے اور انھی کو بیچ کر اپنا پیٹ پالتے۔ ایک دفعہ ان کے مرشد بابا کمال جندیؒ نے حکم دیا کہ قونیہ جاؤ وہاں ایک دل سوختہ رہتا ہے اسے اور گرم کر آؤ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے خود دعا مانگی کہ الٰہی مجھے کوئی ایسا بندہ مل جائے جو میری صحبت کا متحمل ہو سکے۔ غیب سے اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ۔ چنانچہ شمسؒ ۶۴۲ھ، ۱۲۴۵ء میں قونیہ پہنچے اور وہاں کے دل سوختہ سے ملاقات کی۔

چلہ کشی:

شمس تبریزیؒ سے ملاقات کے بعد مولانا اس کے ساتھ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں چلہ کش ہو گئے اور بہ اختلافاتِ روایات تین ماہ یا چھ ماہ تک چلہ کاٹتے رہے۔ اس مدت میں انھوں نے کھانا پینا اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا اور صلاح الدین زرکوبؒ کے سوا کسی کو حجرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ چلہ ختم ہوا تو مولانا کی حالت میں

یکسر انقلاب آ چکا تھا۔ انھوں نے درس و تدریس اور وعظ و افتاء کے اشغال ترک کر دیئے۔ یہاں تک کہ لباس میں بھی تبدیلی اختیار کر لی۔ پہلے سماع سے پرہیز کرتے تھے ،اب اس کے بغیر چین نہ پڑتا تھا۔ اِن سب پر مستزاد یہ کہ حضرت شمسؒ سے دم بھر کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے۔ لوگوں کو مولانا کے تغیرِ حال پر بڑا رنج ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ اس صورت حال کے ذمہ دار شمسؒ ہیں اور اگر وہ قونیہ سے رخصت ہو جائیں تو مولانا پھر اپنے مشاغل اختیار کر لیں گے۔ چناچہ وہ حضرت شمسؒ کے درپے آزار ہو گئے اور ان کے ساتھ گستاخیاں کرنے لگے۔ جب یہ فتنہ انگیزی حد سے بڑھ گئی تو ایک دن شمسؒ سب کی نظریں بچا کر دمشق چل دیئے۔

ایامِ فراق:

حضرت شمسؒ کے جانے کے بعد مولانا اپنے پرانے مشاغل کی طرف کیا لوٹتے ان کی حالت مرغِ بسمل کی سی ہوگئی۔ فراقِ مرشد میں رقت انگیز شعر پڑھا کرتے ،کھانا پینا چھوٹ گیا اور عام لوگوں سے تو کیا اپنے خاص مریدوں اور خادموں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ایک دن حضرت شمسؒ کا خط موصول ہوا تو آتشِ شوق اور بھڑک اٹھی۔ اب ان کی بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی۔ جب ان کی جان کے لالے پڑ گئے تو شمسؒ کو آزردہ کرنے والے لوگ سخت نادم ہوئے اور مولانا کی خدمت میں جا کر معافی مانگی۔ پھر یہ طے پایا کہ مولانا کے صاحب زادے سلطان وُلد کی سرکردگی میں ایک وفد دمشق جائے اور حضرت شمسؒ کو منا کر لائے۔ یہ وفد قونیہ سے روانہ ہونے لگا تو مولانا نے اس کو حضرت شمسؒ کے نام ایک منظوم خط دیا اور اس کے ساتھ ایک ہزار دینار سرخ بھی دیئے کہ حضرت شمسؒ کے آستانہ پر نچھاور کیے جائیں۔

شمس تبریزیؒ کی قونیہ واپسی:

سلطان ولد وفد کو لے کر دمشق پہنچے اور حضرت شمسؒ کو تلاش کر کے مولانا کا خط اور

نذرانہ پیش کیا۔ حضرت شمسؒ نے فرمایا: ''مولانا کا پیغام ہی کافی تھا۔ ان ٹھیکروں کی کیا ضرورت تھی ___ ''انھوں نے اس وفد کو چند دنوں تک مہمان رکھا اور پھر اس کے ساتھ عازمِ قونیہ ہو گئے۔ قونیہ کے قریب پہنچے تو مولانا نے ایک جم غفیر کے ہمراہ بڑی دھوم دھام اور شان وشوکت سے ان کا استقبال کیا۔ مرشد ومرید بڑی دیر تک بغل گیر رہے اور اشکِ مسرت بہاتے رہے۔ حضرت شمسؒ کی مراجعتِ قونیہ نے پھر پرانی صحبتوں کو زندہ کر دیا اور مولانا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ہر وقت خدمتِ مرشد میں مصروف رہنے لگے۔

شمس تبریزیؒ کی دائمی مفارقت:

عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ انھوں نے خدمت مرشد میں مولانا کا حد سے بڑھا ہوا انہماک دیکھا تو پھر حضرت شمسؒ کے خلاف چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ شدہ شدہ یہ چہ مگوئیاں شدید حسد اور بغض کی صورت اختیار کر گئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ قونیہ میں دوبارہ آنے کے دو تین سال بعد ایک دن حضرت شمسؒ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے۔ ۶۴۴ھ یا ۶۴۵ھ۔ عام خیال یہ ہے کہ کچھ مفسدہ پردازوں نے سازش کر کے ان کو شہید کر ڈالا اور نعش غائب کر دی۔ مولانا نے حضرت شمسؒ کی تلاش میں ہر طرف آدمی بھیجے، لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آخر وہ شدّتِ عشق سے مجبور ہو کر خود مرشد کی تلاش میں نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت شمسؒ پھر دمشق چلے گئے ہوں گے، چنانچہ وہ سیدھے دمشق پہنچے اور تلاشِ مرشد میں وہاں کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ اس زمانے میں انھوں نے کئی فراقیہ غزلیں کہیں، ایک غزل میں فرماتے ہیں:

ما عاشق و سر گشتہ و شیدائے دمشقیم
جاں دادہ و دل بستہ سودائے دمشقیم

ایک اور غزل میں کہتے ہیں:

خبر رسید بشام است شمس تبریزی
چہ صبح باکہ نماید اگر بشام رود

جب ان کو دمشق میں کافی عرصہ گزر گیا تو اہل قونیہ نے سربرآوردہ مشائخ، علماء اور امراء کے دستخطوں سے ایک محضر نامہ تیار کرایا اور اس کو ایک وفد کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا واپس نہ جانا چاہتے تھے لیکن لوگوں کی منت سماجت اور اصرار سے مجبور ہو گئے اور واپس قونیہ تشریف لے آئے۔

مولانا کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ حضرت شمسؒ ایک سازش کا شکار ہو کر شہید ہو چکے ہیں اور اس سازش میں ان کے لڑکے علاؤالدین محمد کا ہاتھ بھی تھا۔ چنانچہ وہ علاؤالدین محمد سے سخت ناراض ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ علاؤالدین مولانا کی زندگی ہی میں بڑی مصیبتیں اٹھا کر فوت ہو گیا۔ مولانا نے نہ تو اس کی عیادت کی اور نہ ہی اس کے جنازے میں گئے۔

صلاح الدین زرکوبؒ کی رفاقت و ہم نشینی:

حضرت شمسؒ کے بعد مولانا نے شیخ صلاح الدین زرکوبؒ کو اپنا محرم راز اور رفیق بنا لیا۔ وہ ابتدا سے صاحب حال تھے اور مولانا کے پیر بھائی تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک دن اپنی دکان میں چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے کہ مولانا دکان کے سامنے سے گزرے۔ ہتھوڑی کی آواز نے ان پر سماع کا اثر کیا اور وہ بے خود ہو کر وہیں رقص کرنے لگے۔ گھنٹوں یہ کیفیت جاری رہی۔ پھر شیخ زرکوبؒ دکان سے باہر نکل آئے۔ مولانا ان سے بغل گیر ہو گئے اور عالم بے خودی میں دن ڈھلنے تک یہ شعر پڑھتے رہے:

یکے گنجے پدید آمد درآں دکانِ زرکوبی
زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

شیخ زرکوبؒ نے اس وقت ساری دکان لٹوادی اور اپنے آپ کو ہمہ تن مولانا کی خدمت

کے لیے وقف کر دیا۔ اس دن کے بعد وہ مرتے دم تک دکان پر نہ بیٹھے اور مسلسل دس برس تک مولانا کے ہم جلیس و ہمراز رہے۔ اس دوران میں مولانا نے اپنے صاحبزادے سلطان ولد کا عقد شیخ صلاح الدین کی صاحبزادی سے کر دیا اور اس طرح ان دونوں میں سمدھیانے کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ ۶۶۴ھ، ۱۲۶۶ء میں حضرت زرکوب دنیائے فانی سے عالم بقا کو سدھار گئے۔ مولانا کو ان کی وفات پہ سخت صدمہ پہنچا۔ اسی حالت میں ایک دل دوز غزل لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

اے زہجراں در فراقت آسماں بگریستہ
دل میان خون نشستہ عقل وجاں بگریستہ
چوں بعالم نیست یک کس مرمکانت راعوض
درعزائے تو مکان و لامکاں بگریستہ!
جبرئیل و قدسیان راباں و پرارزق شدہ
انبیاء واولیا را دیدگان بگریستہ

مولانا سر برہنہ ہو کر بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتے۔ جنازہ اٹھا تو قوالوں کی آٹھ جوڑیاں اس کے آگے سماع کر رہی تھیں اور مولانا عالمِ وجد میں چرخ لگاتے اس کے ساتھ جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے محبوب رفیق کو شیخ بہاؤالدین کی قبر کے پہلو میں دفن کیا اور کئی دن تک سخت ملول و محزون رہے۔

شیخ حسام الدین چلپیؒ سے تعلق:

شیخ زرکوبؒ کی وفات کے بعد مولانا کو ایک ایسے محرمِ راز اور رفیقِ خاص کی ضرورت ہوئی جس میں ان کو شمس تبریزؒ کا جلوہ نظر آئے۔ ایسا محرم راز ان کو شیخ حسام الدین حسن بن محمد حسن چلپیؒ کی صورت میں مل گیا۔ شیخ حسام الدین چلپیؒ پہلے ہی مولانا کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ شیخ زرکوب کے بعد مولانا نے ان کو اپنا خاص ہمدم و ہمراز بنا لیا۔ انھوں نے

بھی پورے دس برس تک اس قدر رتندہی اور حسنِ عقیدت کے ساتھ مولانا کی خدمت کی کہ دونوں یک جان و دو قالب ہو گئے۔ شیخ چلپی مولانا کا اِس قدر احترام کرتے تھے کہ دس برس میں انھوں نے ایک مرتبہ بھی مولانا کے وضوخانہ میں وضو نہیں کیا۔ گرمی ہو یا جاڑا، آندھی ہو یا طوفان وہ ہمیشہ گھر جا کر وضو کر آتے۔ یہ شیخ حسام الدین چلپی ہی کی تحریک اور ترغیب تھی کہ جس نے مولانا کو اپنی شہرہ آفاق مثنوی کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ مثنوی شریف میں مولانا نے جا بجا حسام الدین کا ذکر بڑے حسین انداز میں کیا ہے مثلاً :

اے ضیاء الحق حسام الدین توئی	کہ گزشت از مہ بنودت مثنوی
ہمت عالی تو اے مرتجی	می کشیداین راخدادا ندکجا
گردن ایں مثنوی رابستۂ	می کشی آنسو کہ تو دانستۂ
زاں ضیاء گفتم حسام الدین ترا	کہ تو خورشیدی وایں دو وصفہا
شمس را قرآن ضیا خوانداے پدر	واں قمر رانور خوانداین رانگر
ہمچناں مقصود من زین مثنوی	اے ضیاء الحق حسام الدین توئی
شہ حسام الدین کہ نور انجم است	طالب آغاز سفر پنجم است
اے حیات دل حسام الدین بسی	میل می جو شد بہ قسم سادگی
پیش کش می آرمت اے معنوی	قسم سادس در تمام مثنوی
اے ضیاء الحق حسام الدین فرید	دولت پائندہ فقرت بر مزید

علالت اور وفات:

۶۷۲ ھ میں مولانا شدید بیمار ہو گئے۔ اچھے سے اچھے طبیبوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

لوگ جب ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے تو پوچھا کہ آپ کہ نماز جنازہ کون پڑھائے

گا؟ فرمایا مولانا صدرالدین وہ شیخ محی الدین اکبر (ابن عربی) کے شاگرد اور علم و فضل کے اعتبار سے نہ صرف قونیہ بلکہ روم و شام کے تمام علماء میں یگانہ مانے جاتے تھے۔ جانشین کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا حسام الدین چلپی میری جگہ سنبھالے گا۔ یہ وصیتیں کر کے ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ کی شام کو واصل بحق ہوئے۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے:

مولانا کی رحلت کی خبر اہلِ قونیہ پر بجلی بن کر گری۔ گھر گھر میں ماتم برپا ہو گیا۔ صبح کو جنازہ اٹھا تو انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس کے ساتھ تھا۔ اس میں ارضِ روم کا فرماں روا، امرائے سلطنت، جوان، بوڑھے، عالم، جاہل، اغنیاء، فقراء ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ حد یہ کہ یہود اور نصاریٰ بھی توریت اور انجیل کی آیتیں پڑھتے اور گریہ وزاری کرتے جنازہ کے ساتھ تھے۔ ایک طرف قوالوں کی بیس جوڑیاں سماع میں مشغول تھیں تو دوسری طرف بے شمار حفاظ اور قراء قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ آگے چل رہے تھے۔ راستے میں تابوت کا صندوق کئی بار بدلنا پڑا اور اس کے تختے تبرک کے طور پر تقسیم کیے گئے۔ جنازہ صبح چلا تھا لیکن شام تک بہ مشکل قبرستان پہنچ سکا۔ حسبِ وصیت شیخ صدرالدین نماز جنازہ پڑھانے کھڑے ہوئے لیکن فرطِ الم سے غش کھا کر گر پڑے اور قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ تدفین کے بعد مزار پر چالیس دن تک لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

سات صدیاں گزر چکی ہیں لیکن مزار مبارک آج تک قونیہ میں مرجع خاص و عام ہے۔ مولانا کے فرزند سلطان وُلدؒ نے اپنے عظیم المرتبت والد کی وفات اور جنازہ کی مختصر کیفیت ان اشعار میں بیان کی ہے:

پنجم ماہ در جماد آخر — بود نقلان آں شہِ فاخر
سال ہفتاد و دو بُدہ بعدد — شش صد از عہد حضرت احمد

چشم زخمی چناں رسید آن دم	گشت نالاں فلک دراں ماتم
مردم شہر از صغیر و کبیر	ہمہ اندر فغان آہ و تفسیر
دیہیان ہم زرومی و اتراک	کردہ ازدرد اوگریباں چاک
بہ جنازہ ہمہ شدہ حاضر	از سر مہر عشق تو پے بر
کردہ اورا مسیحان معبود	دیدہ اورا جہود خوب چوہود
عیسوی گفت اوست عیسیٰ ما	موسوی گفت اوست موسیٰ ما
ہمہ کردہ غم گریباں چاک	ہمہ از سوز کردہ بر سرِ خاک
ہمچناں ایں کشید تا چہل روز	ہیچ ساکن نشد مے تف و سوز
بعد چہل روز سوئے خانہ شدند	ہمہ مشغول ایں افسانہ شدند

اولاد وحفاد:

مولانا کے دو فرزند تھے۔ سلطان وُلد اور علاؤالدین محمد۔ موخرالذکر کا نام حضرت شمس تبریزیؒ کے قاتلوں میں لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ سلطان وُلدؒ علوم ظاہری و باطنی میں درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شیخ حسام الدین چلپیؒ مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ جب انھوں نے ۶۸۴ھ میں وفات پائی تو سلطان وُلد اتفاق عام سے پدر بزرگوار کے جانشین بنے۔ پورے اٹھائیس سال مخلوق خدا کو فیض پہنچانے کے بعد انھوں نے ۷۱۲ھ میں چھیانوے برس کی عمر میں پیک اجل کو لبیک کہا۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ چلپی عارف، چلپی عابد، چلپی زاہد، چلپی واجد۔ فرزند اکبر چلپی عارف مولانا روم کی زندگی ہی میں پیدا ہوئے تھے اور مولانا کو بے حد عزیز تھے۔ سلطان وُلدؒ کی وفات کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے ان کے بعد چلپی عابدؒ مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

مولانا کا روحانی سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ جلالیہ اور مولویہ کے نام سے مشہور ہے۔

تصانیف

تذکرہ نگاروں نے مولانا رومؒ کی تین تصانیف کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔

۱۔ دیوان:

اس میں تقریباً پچاس ہزار اشعار ہیں۔اس کو لوگوں نے غلطی سے شمس تبریزؒ سے منسوب کر دیا ہے۔

۲۔ مثنوی:

اس کے چھ دفتر (حصے) ہیں۔بقول مولانا شبلیؒ یہی کتاب ہے جس نے مولانا کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے اور جس کی شہرت اور مقبولیت نے ایران کی تمام تصانیف کو دبالیا ہے۔

۳۔ فیہ مافیہ:

یہ کتاب مولانا کے ان خطوط و ارشادات کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً وزیر سلطنت معین الدین پروانہ کے نام لکھے اور جن کو بعد میں مولانا کے فرزند سلطان وُلدؒ نے مرتب کیا۔

ان کے علاوہ مولانا کے ایک سو چوالیس خطوط کا مجموعہ ''خطوط رومی'' کے نام سے اور آپ کے ان اقوال و مواعظ کا مجموعہ جو آپ نے شمسؒ کی ملاقات سے پہلے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائے تھے ''مجالس سبعہ'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔موخرالذکر کتاب کے تین حصے ہیں۔

علم و فضل میں مولانا رومؒ کا مقام:

مولانا علم و فضل کے بحرِ زخار تھے۔راہِ فقر اختیار کرنے سے پہلے ان کے درس و افتاء اور وعظ و ارشاد کا ایک دنیا میں غلغلہ پڑا ہوا تھا۔قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ،

مناظرہ غرض کوئی علم ایسا نہ تھا جس پر ان کو عبور کامل حاصل نہ ہو۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے علم و فضل کے بارے میں بے شمار واقعات لکھے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق دو تین یہاں درج کیے جاتے ہیں :

ایک دفعہ جمعتہ المبارک کے دن مولانا نے اپنے وعظ میں قرآن حکیم کی چند آیتوں کی تفسیر بیان کرنی شروع کی۔ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حاضرین میں ایک فقیہہ بھی تھے جن کو اپنی علمی قابلیت پر بڑا گھنڈ تھا۔ انھوں نے برسرِ عام کہا کہ چند آیتیں پہلے سے مخصوص کر لی جاتی ہیں اور انھی کی تفسیر یہاں بیان کر دی جاتی ہے۔ احسن طریقہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصہ بھی پڑھا جائے اس کی تفسیر برجستہ بیان کی جائے۔

مولانا نے فرمایا کہ آپ کوئی سورہ پڑھیے میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ فقیہہ نے سورۃ والضحیٰ پڑھی۔ مولانا نے اس سورۃ کے دقائق اور نکات بیان کرنے شروع کیے تو صرف والضحیٰ کے واؤ کی تفسیر بیان کرتے کرتے شام ہوگئی۔ تمام حاضرین مولانا کی علمی بصیرت پر سر دھننے لگے۔ فقیہہ صاحب کی یہ حالت ہوئی کہ عالم بیخودی میں اپنا گریبان چاک کر ڈالا اور مولانا کے قدموں میں گر پڑے۔

ایک دفعہ مولانا نے کسی مسئلہ میں فتویٰ لکھا تو قونیہ کے ایک نامور عالم شمس الدین ماروفی نے یہ کہہ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ بے سند معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے سنا تو کہلا بھیجا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یہ مسئلہ درج ہے۔ لوگوں نے تحقیق کی تو فی الواقع یہ مسئلہ وہاں موجود تھا۔

ایک دن ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی مٹی کو خود خمیر کیا۔ مٹی میں گھاس بھی ملائی یا نہیں۔ فرمایا اس کا جواب مجھ سے کیا پوچھتے ہو، قرآن حکیم ہی سے پوچھو جس میں فرمایا گیا ہے: خلق الانسان من صلصال کا لفخار انسان کا خمیر محض مٹی اور

پانی سے تھا۔

اخلاق و عادات:

مولانا کا صحیفۂ اخلاق ایسے پاکیزہ اور دل آویز پھولوں سے مزین تھا کہ جن کی خوشبو سے روح تازہ ہوتی تھی۔ان کا زہد و قناعت، انکسار، تواضع، شب بیداری، توکل علی اللہ، حلم و تحمل، جود و سخا، حق گوئی، اکلِ حلال، ایثار، شیریں کلامی، مخلوقِ خدا سے محبت اور دوسرے اوصاف حمیدہ مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔تذکرہ نویسوں نے ان کے اخلاقِ حسنہ اور عاداتِ پسندیدہ کے بارے میں بیسیوں واقعات لکھے ہیں۔ان میں سے کچھ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا کی ریاضت اور مجاہدہ کی یہ کیفیت تھی کہ ساری ساری رات عبادت کرتے گزر جاتی تھی۔ان کے خدام کا بیان ہے کہ انھوں نے برسوں مولانا کو کبھی شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا۔اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے اور دو دو تین تین ہفتے کچھ نہ کھاتے تھے۔نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ رو ہو جاتے اور خشیت الٰہی سے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ نماز میں استغراق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ عشاء کی نیت باندھی اور دو رکعتوں میں ساری رات بیت گئی۔کئی دفعہ نماز میں گریہ طاری ہو جاتا اور ساری ریش مبارک اور کپڑے آنسوؤں سے بھیگ جاتے تھے۔

بادشاہ اور امراء اکثر نقدی اور تحائف بھیجتے رہتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھتے تھے اور سب کچھ شیخ صلاح الدین زرکوبؒ یا شیخ حسام الدین چلپیؒ کے ہاں بھجوا دیتے تھے کہ راہ خدا میں صرف کر دیں۔ان کے در سے کوئی سائل کبھی محروم نہ جاتا تھا۔اگر کوئی اور چیز پاس نہ ہوتی تو اپنی عبا یا کرتا یا جو کپڑا بدن پر ہوتا وہی اتار کر اس کو دے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک تاجر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کثیر مال اور تحائف مولانا کی خدمت میں پیش کیے کہ اپنے تصرف میں لائیں۔مولانا نے فرمایا بھائی نہ تو میرے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیوی سامان تھا اور نہ مجھے دنیا پسند ہے،

مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو، بہتر یہ ہے کہ اس مال کو اپنے ہاتھ سے محتاجوں اور غریبوں میں تقسیم کر دو اور مجھ کو اور میرے دوستوں کو اس تکلیف سے معاف رکھو۔

مولانا نے ایک دفعہ اپنے چند خُدّام وزیر سلطنت معین الدین پروانہ کے پاس کسی کام کے لیے بھیجے۔ جب وہ واپس آئے تو معین الدین کے عالی شان مکانات اور اور پر تکلف کھانوں کی بے حد تعریف کی۔ مولانا نے ایک آہ بھر کر فرمایا:

''اے غافلو دنیا کی غلاظت اور فنا ہو جانے والی عمارتوں کی اس قدر تعریف کر رہے ہو تمھیں شرم نہیں آتی''۔

اے بدیدہ لونہائے چرب خیز
فضلہ اورا بہ بیں در آب ریز

خدام بڑے شرمندہ ہوئے اور پھر کبھی انھوں نے مولانا نے سامنے دنیاوی چیزوں کی تعریف نہیں کی۔

ایک دفعہ مولانا سماع سن رہے تھے۔ ایک شخص عالمِ وجد میں بار بار مولانا سے جاٹکراتا تھا۔ لوگوں نے اس کو بزور مولانا کے پاس سے اٹھا کر دور بٹھا دیا، آپ سخت ناراض ہوئے۔ اور فرمایا: ''شراب تو اس نے پی ہے اور بدمستی تم کرتے ہو۔''

ایک دن مولانا کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ او لعین! اگر تو ایک کہے گا تو میں دس سناؤں گا ــــــ مولانا نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا چاہتے ہو مجھ کو کہہ لو۔ مجھے اگر ہزار سناؤ گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔ دونوں بہت شرمندہ ہوئے اور آپس میں بغل گیر ہو گئے۔

ایک دفعہ آپ کی اہلیہ نے اپنی لونڈی کو سزا دی۔ مولانا کو علم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ سب آدمی ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں۔ کوئی شخص خدا کے سوا کسی کا غلام

نہیں۔آپ کی اہلیہ نے اسی وقت اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

مولانا کو اوقاف کی مد سے پندرہ دینار ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔گو حکومت کی طرف سے آپ کو کوئی ذمہ داری نہیں سونپی گئی تھی لیکن آپ اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے۔ خدام کو تاکید کر رکھی تھی کہ رات ہو یا دن کوئی فتویٰ پوچھنے آئے تو مجھ کو ضرور اطلاع دو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدرالدین قونوی کو ہزاروں روپے ماہوار وظیفہ ملتا ہے اور آپ کو صرف پندرہ دینار۔ یہ انصاف سے بعید ہے۔

فرمایا کہ شیخ کے اخراجات بھی بہت ہیں اور یہ بعید از انصاف نہ ہوگا کہ میرے پندرہ دینار بھی ان کو دے دیئے جائیں۔

مولانا بادشاہوں اور امراء کے درباروں اور مجلسوں میں جانے سے سخت احتراز کرتے تھے۔البتہ وہ آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتے تو حسنِ خُلق کی وجہ سے مل لیتے تھے۔

مولانا رومؒ کے کلام کانمونہ

مثنوی

روغن اندر دوغ باشد چوں عدم
دوغ در ہستی بر آوردہ علم

نیست را بنمود ہست آں محتشم
ہست را بنمود بر شکلِ عدم

دست پنہاں وقلم بین خط گزار
اسپ در جولان ناپیدا سوار

بحر را پوشید کف کرد آشکار
بادرا پوشیدنموودت غبار

خاک را بنی بہ بالا اے علیل
بادرانہ جزبہ تعریف و دلیل

تیر پیدا بین و نا پیدا کما
جانہا پیدا و پنہاں جانِ جاں،

عاشق را ہر نفس سوزیدنی ست
بردہ دیراں خراج عشر نیست

در درونِ کعبہ رسمِ قبلہ نیست
چہ غم از غواص راپا چلہ نیست

ملّت عشق از ہمہ دینہا جداست
عاشقاں رامذہب وملّت خداست

غزل

اے از جمال حسن تو عالم فسانہ
مقصود حسن تست دگرہا بہانہ

نقاش راگرز جمالِ تو قبلہ نیست
مقصود او چہ بودز نقشے و خانہ

اے صد ہزار شمع نشستہ پراز امید
گرد تنور عشق زبہر زبانہ

زخاکِ من اگر گندم برآید — ازدگر نان پذی مستی فزاید
شود دیوانہ سازندہ پزندہ — تنورش بیت مستانہ سراید
میا بے دف بگورم اے برادر — کہ در بزمِ خدا غمگین نشاید
منم مست و مرا اصل از مے عشق — مگواز من بجز مستی چہ آید

رعد مطرب برق مشعل ابر ساقی آب مے
باغ مست و زاغ مست و غنچہ مست و خارمست
آسمانا چند گردی گردش عنصر بہ بیں
خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست
حالِ صورت ایں چنیں و حال معنی خود مپرس
نفس و عقل و روح مست دائماً اسرار مست
ازتقاضا ہائے مستاں وزن نفیرِ عاشقاں،
دَرشفاعت مُوبموئے احمد مختار مست
اُو سرست و ماچودستار اندروپیچیدہ ایم
از شراب ایں سر ہے گرد دسرودستار مست
از جلال قدس او شیدا ابوبکرؓ و عمرؓ
باز عثمانؓ ازجمال و حیدرؓ کرّار مست
شمس تبریزیؒ درآید در دلم بزمے نہاد
ازشرابِ عشق حق بنگر درودیوار مست
من خمش کر دم چو درمن کشت مستی آشکار
باد پیائد چو گوید ہر سخن بسیار مست

باز شہدے باشکر آمیختہ	عاشقاں باھم دگر آمیختہ
روز وشب راازمیاں برداشتند	آفتابے باقمر آمیختہ
رنگِ معشوقان ورنگِ عاشقاں	جملہ ہمچو سیم و زر آ میختہ
چوں بہار سرمدئے حق رسید	شاخِ خشک و شاخِ تر آمیختہ
زاں عجب تر آنکہ اندر ہردمے	ایں اماں چوں باخطر آمیختہ

ازمن دوسہ سخن شنو اندر بیانِ عشق
گرچہ مراز عشق سر گفت و گوئے نیست
اکنوں بد انکہ عشق ہم اول ہم آخر ست
زاں سو نظر مکن کہ ازاں سوئے سوئے نیست
ایں عشق مے فروش قیامت ہمی کند
زاں بادۂ کہ در خور خم و سبوئے نیست

مولانا رومؒ کی ولادت، حصول تعلیم، مختلف اساتذہ سے اکتسابِ فیض، مختلف علمی اور روحانی شخصیات سے آپ کی رفاقت، شادی، علمی وروحانی فیضان، شیخ شمس تبریزؒ سے آپ کی والہانہ عقیدت ودل بستگی، حضرت صلاح الدین زرکوب سے تعلق اور رشتہ داری اور حضرت حسام الدین چلپیؒ سے آپ کے تعلق خاطر کے مختصر تذکرے کے ساتھ آپ کے کلام کا نمونہ متذکرۃ الصدر سطور میں قارئین کرام کی نظر سے گزرا۔ آپ کے سوانح اور عملی خدمات کے اسی مختصر اور اجمالی جائزے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آئندہ ابواب میں آپ کی حکیمانہ اور علمی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

باب دوم

☆ مولانا روم قدس سرہ العزیز کی حکیمانہ مجالس

اسرار توبہ:

۱۹مارچ ۱۹۵۰ء: گیلانی (بہار) عارف معنوی کے دربار میں حاضری کی سعادت میسر آئی۔ارشاد ہوا،قصہ بیان فرمانے لگے مکتب خانہ میں بچہ پڑھ رہا تھا قـــل ارایتـــم ان اصبـح ماء کم غورًفمن یاتیکم بماء معین(کہو!اگر تمھارا پانی سٹک جائے تو تمھارے لیے بہتے پانی کو کون لائے)راستے سے ایک فلسفی منطق باز ذلیل وخوار گزر رہا تھا۔قرآنی سوال کے جواب میں بولا، کدال اور سبل سے کھود کر پانی نکال لوں گا (یعنی سائنس کے زور سے اس مشکل کو حل کرلوں گا)۔رات ہوئی فلسفی نے خواب میں دیکھا کہ ایک شیر مرد سامنے کھڑا ہے اور اس نے کھینچ کر فلسفی کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ایسا طمانچہ کہ دونوں آنکھیں فلسفی کی بہہ گئیں اور شیر مرد پوچھ رہا ہے یعنی :

گفت زیں دو چشمہ اے شقی — باتبر نورے بیار از صادق

صبح بیدار ہونے کے بعد فلسفی کو محسوس ہوا کہ واقعی اس کی دونوں آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں،قصہ ختم ہوگیا۔آگے مولانا نے فرمایا:

''چاہتا تو اس پانی کو بھی وہ واپس لاسکتا تھا لیکن اس چشمہ کا پانی کدال اور پھاوڑے سے نہیں بلکہ توبہ اور استغفار کی راہ سے واپس ہوسکتا ہے۔مگر افسوس کہ فلسفی توبہ اور استغفار کی سائنس سے جاہل تھا، جاہل کردیا گیا۔''

ارشاد ہوا کہ

توبہ واستغفار کا ذوق بھی ہر شخص کو میسر نہیں آتا۔فرمایا کہ بدکرداری اور سرکشی وانکار کی سزا آدمی کو یہ ملتی ہے کہ توبہ کی راہ اس کے دل پر بند کردی جاتی ہے:

☆ افادیتِ عالیہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ

زشتیٔ اعمال شومی جحود راہ توبہ بر دل او بستہ بود

فرمایا: نیاز و اعتقاد کی قوت میں جیسے یہ اثر ہے کہ محالات کو بھی ممکن بنا دیتی ہے، آگ باغ بن جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح بداعتقادی و بدکرداری کا الٹا اثر یہ ہوتا ہے کہ سونا چھولے تو مٹی ہو جائے اور صلح کا ارادہ کرے تو جنگ کی صورت پیدا ہو جائے :

ہم چنیں برعکس آں انکارِ مرد مس کند زر را و صلحی راں برد

فرمایا کہ :

زشتیٔ اعمال و اعتقاد سے دل پتھر بن جاتا ہے۔ پتھر کو جوت کر غلہ نہیں اگایا جا سکتا ہاں! شعیب علیہ السلام جیسے پیغمبروں میں اتنا زور تھا کہ پہاڑ کو خاک بنا دیتے تھے، ایسی خاک جس میں کھیتی اگائیں، سنگین دلوں کو چاہیے کہ شعیبی رنگ کا آدمی ملے تو اپنا دل اس کے سپرد کر دیں۔

پھر فرمایا کہ :

''فلسفی نے بھی سمجھو کہ دعا کی تھی لیکن اس کی دعا ''مسخ'' کو کھینچ کر لائی، اچھی قابل کشت مٹی کو بھی اس نے سنگ ریزہ کا میدان بنا دیا۔ بہ ہر حال ہر دل میں ذوقِ سجدہ پیدا ہو، ہر کام کی مزدوری رحمت میں ملے، یہ قدرت کا دستور نہیں، فلسفی نے جو محنت کی تھی اس کا صلہ یہ ملا کہ غریب سجدے کی توفیق سے محروم ہو گیا۔''

مولانا نے پھر ''توبہ'' کے متعلق تنبیہ فرمائی کہ ''توبہ کر لوں گا'' اس بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب جو کرے گا وہ توبہ سے محروم کر دیا جائے گا۔ فرمایا کہ اس قسم کا گستاخ آدمی گناہ کے بعد منہ سے بے شک توبہ و استغفار کے الفاظ نکالے لیکن نہ اس کی توبہ، توبہ ہے اور نہ اس کا استغفار، استغفار ہے۔

فرمایا:

توبہ کی حقیقت اپنے ساتھ کچھ علامتوں کو رکھتی ہے۔ جیسے بارش سے پہلے بجلی کڑکتی

ہے، بادل گرجتے ہیں۔اسی طرح حقیقی توبہ کرنے والے پر گریہ طاری ہوتا ہے، چلاّتا ہے، شور کرتا ہے تو غضب الٰہی کی آگ اسی توبہ کی بارش سے بجھ سکتی ہے۔

تانباشد برق دل وآب وچشم کے نش بند آتش تہدید وخشم

• بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج میں جو بارش ہوتی ہے اسی بارش سے کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، باغ ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

پھر مولانا کی توجہ دوسرے مسئلے کی طرف ہوگئی، فرمانے لگے:

توحیدِ اَفعالی:

ان ہرے بھرے کھیتوں، باغوں کو دیکھتے ہو، فاختہ کوکو کر رہی ہے، بلبل چہچہا رہی ہے، لالہ دمک رہا ہے، پھول مہک رہے ہیں:

از کجا آوردہ اندیں حلہا من کریم و من رحیم کلہا

فرمایا:

''یہ ساری لطافتیں جن کا نظارہ کر رہے ہو، کیا ہیں؟ کسی کا پتہ ہی تو دے رہی ہیں:

آں لطافتہا نشان شاہدیست

مگر ان چیزوں پر اس نقطۂ نظر سے ہر شخص کی نگاہ نہیں پڑتی۔ بادشاہ کو جس نے دیکھا ہے وہی اس کی نشانیوں کو پہچانتا ہے، بادشاہ دکھایا گیا تھا، جس کے اندر اس کی یاد رہ گئی ہے وہی مست الست بنا ہوا ہے۔

فرمایا:

''خواب میں کسی کے ایک صاحب آئے اور بتایا کہ کل تم سے ملوں گا، فلاں فلاں نشانیوں سے تم مجھے پہچان لوگے مگر اس خواب کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔صبح ہوئی خواب دیکھنے والا گلی گلی کوچہ کوچہ ڈھونڈنے لگا، اس کی حرکتوں پر بعض کو تعجب بھی ہوتا، بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق جسے ڈھونڈ رہا تھا اچانک وہ سامنے آگیا، سامنے آنا تھا کہ یہ اس سے لپٹ پڑا، چیخ مار کر بے ہوش ہوگیا۔دیکھنے والے متحیر تھے کہ اس غریب کو کیا ہوا۔مگر

ایں نشاں درحق او باشد کہ دید
آں دگر را کے نشاں آید پدید

الحاصل یہ کہ یہ کائنات اور اس کا ذرہ ذرہ مست روزِ الست کے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ مچھلی کے لیے پانی۔

ماہی بے چارہ راپیش آمد آب
ایں نشانہا تلک آیات الکتاب

مچھلی پانی میں پہنچ گئی ،قرآن میں بتانے والے نے اپنی نشانیاں بتائی ہیں ،ان نشانیوں سے جو اس کو ڈھونڈے گا پائے گا۔(دفتر دوم)

خدائی امتحان کیوں ہے:

بعد مغرب حضرت مولانا کی مجلس میں حاضر ہوا۔ارشاد ہو رہا تھا:

''ایک دن مرتضٰی علیہ السلام سے ایک پاجی نے پوچھا اور اس وقت حضرت ایک کھوٹھے پر تھے جو کہ کافی بلند تھا، پاجی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے محافظ ونگہبان ہیں ،حضرت نے فرمایا کیوں نہیں؟ بچپن بلکہ آدمی جب نطفے کی شکل میں رہتا ہے اسی وقت سے وہ بندوں کی حفاظت ونگرانی کرتا چلا آرہا ہے (ورنہ ان نازک منزلوں سے گزر کر بھلا کیوں کر آدمی بن سکتا ہے؟ (مناظر احسن گیلانی)) تب پاجی نے کہا کہ تو پھر براہِ مہربانی اس کوٹھے سے اپنے آپ کو نیچے گرائیں ،دیکھیں آپ کی حفاظت آپ کا خدا فرماتا ہے؟ دعویٰ آپ کا مدلّل ہو جائے گا۔جواب میں حضرت مرتضٰی علیہ السلام نے فرمایا، بے وقوف! چپ رہ تو نے بڑی جرأت سے کام لیا،کہیں اسی کے تم شکار نہ ہو جاؤ اور اس کو سمجھانے لگے کہ بھائی !اپنے مالک کا امتحان بندے سے؟ بندے کو اس کا حق کس بنیاد پر حاصل ہے؟ ارے احمق (کج وکول) کس کا پتہ ہے کہ اپنے مالک کا امتحان لے۔ہاں! خدا اپنے بندے کا امتحان لے تو وہ اس کا جائز حق رکھتا ہے''۔

یہ مطلب خدا کا امتحان سے نہیں ہوتا کہ جس چیز کو وہ نہیں جانتا امتحان کر کے اس کو

معلوم کرے بلکہ :

تابما ، مارا نماید آشکار   کہ چہ داریم از عقیدہ درسرار

یعنی آدمی خود اپنے باطنی حال سے واقف نہیں ہوتا، بہت سی غلط فہمیوں میں اپنے متعلق خود مبتلا رہتا ہے۔امتحان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے باطنی حال سے وہ خود آگاہ ہو جائے''تابما، مارا نماید آشکار'' چاہتا ہے کہ خود اپنے آپ پر ہم جو کچھ ہیں ظاہر ہو جائیں۔

بہر حال حق تعالیٰ کے متعلق یہ کتنی بڑی گستاخی ہوگی کہ کوئی خدا کے سامنے کھڑا ہو کر کہے کہ لیجیے میں آپ کے فلاں حکم کو توڑتا ہوں اور امتحان لیتا ہوں کہ آپ میں حکم کا کمال کتنا ہے؟ یہ خیال کر کے جو گناہ کا ارتکاب کرتا ہے یعنی خدا کے حکم کو جانچنا چاہتا ہے۔اس کی یہ توجیہہ یا گناہ کا عذر اس گنا سے بھی بڑھا ہوا پاپ ہے۔

پھر مولانا حسب عادتِ دوسری طرف متوجہ ہو گئے کہ دوسروں کو جانچتے پھرتے ہیں حالاں کہ سب سے پہلے جانچنے کی چیز اپنے لیے ہم خود ہیں،

امتحان خود چو کردی اے فلاں   فارغ آئی زامتحان دیگراں

اپنے امتحان سے اگر تم پر ثابت ہو کہ تم مرچ نہیں بلکہ شکر دانہ ہو تو اسی سے تم حق تعالیٰ کے علم کا سراغ لگا سکتے ہو یعنی اگر تم مستحق نہ ہوتے تو ''شکر'' تم میں پیدا نہ کرتا۔دانش مند آدمی کبھی موتی کو سنڈاس (بیت الخلاء) میں نہیں ڈالتا اور جو عقل رکھتے ہیں وہ بھوسے پر گیہوں کو نہیں سڑاتے تو حق تعالیٰ جو علیم و حکیم ہیں تجھ میں شکر پیدا نہ کرتے۔

پھر ارشاد ہوا کہ:

''اسی طرح مرید ہو جانے کے بعد پیر کا امتحان بھی بد بختی ہے، بلکہ امتحان لینے والے کا امتحان ہو جاتا ہے کہ یقین کی دولت سے مرید خالی ہے۔بلکہ تمھارے اندر گستاخی اور جہالت کے جو جراثیم ہیں وہ پیر کے امتحان سے باہر نکل آتے ہیں۔''

ارشاد ہوا کہ

''ذرہ پہاڑ تولنے چلا، ترازو اسے کہاں ملے گی، خود اپنے آپ کو ایک پلڑے میں رکھ کر تولے گا۔''

چوں نہ گنجد او بہ میزبان خرد   پس ترازوے خرد را بردرد

بہ ہر حال حق تعالیٰ کے امتحان کا وسوسہ بھی دل میں کسی کے آئے تو چاہیے کہ فوراً سر بہ سجود ہو کر گڑ گڑائے کہ اے پروردگار! اس گمان اور شک کی بیماری سے مجھے نجات عطا فرمایئے۔

پھر مولانا نے ایک مثال بیان کی کہ حق تعالیٰ کے امتحان کا وسوسہ جس کے دل میں ہو وہ سمجھ لے کہ اس کے دین کے صحن میں عن خروب پیدا ہو گیا ہے۔ خروب کیا ہے؟ فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو مطلع کیا گیا کہ مسجد کا کام تم سے نہیں لیا جائے گا۔ ''کیوں پروردگار؟'' داؤد علیہ السلام نے عرض کی۔ ''تمھارے نغمے پر جانیں گئی ہیں'' جواب ملا ''۔ مگر میں تو مغلوب تھا۔'' داؤد علیہ السلام نے عرض کی۔ اب اس کی شرح ہونے لگی، فرمایا کہ ''مغلوب تھا'' معدوم تو نہیں ہوتا لیکن اسے معدوم کہتے ہیں کہ اپنی خودی سے غائب ہو کر سب سے بڑی ہستی کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ مسلوب الاختیار نہیں ہوا بلکہ اختیار کا جو آخری سرچشمہ تھا اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔

منتہائے اختیار آنست خود   کہ اختیارش ایں جا مفتقد

بلکہ سے ''اختیار'' کا مزہ اسی لیے آدمی کو چکھایا جاتا ہے تا کہ اختیار مطلق کی طلب اس میں پیدا ہو، جس کے حاصل کرنے کی صورت وہی ہے کہ اپنی ''انانیت'' کھو بیٹھے۔

پھر فرمایا کہ

''لذائذ مشروبات و ماکولات کی لذت ترک لذت سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کے لیے یہ چیزیں بے لذت ہو گئیں تو اسی لیے ہو گئیں کہ لذتی (لذت کا دلدادہ) بن کر اس نے اتنا مزہ اڑایا کہ ترک کا موقع نہ مل سکا۔ اسی طرح اختیار کی لذت سے آشنا ہو جانے کے بعد اگر کوئی ترک اختیار کچھ دن کرے تو اب اختیار مطلق کی دولت اس کو حاصل ہو گی،

بجائے اس کے جو اس اختیار مجازی کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کرے گا تو اختیار کی لذت سے محروم ہو جائے گا۔ (دفتر چہارم)

تقلیدی و تحقیقی علم کا فرق:

۴ ستمبر ۱۹۵۰ء: مولانا معنوی کی مجلس میں حاضری کی سعادت میسر آئی۔ آج دو لطیفے ارزانی ہوئے۔ دلقک کا لطیفہ جس نے عفیفہ عورتوں کو چھوڑ کر زن بازاری سے عقد کر لیا تھا۔ کسی بزرگ نے دریافت کیا میاں دلقک! تم کو نیک چلن عفیفہ عورت نہیں ملتی جو اس بازاری قحبہ سے تم نے عقد کر لیا۔ مجھ سے کہتے تو ایک خوش کردار زن مستورہ پردہ نشین تمھارے لیے مہیا کر دیتا۔

دلقک نے عرض کی حضرت والا! کیا عرض کروں اس عقد سے پہلے کتنی پردہ نشین مستورہ عورتوں سے فقیر نے نکاح کیا، لیکن سب ہی قحبہ بن کر نکل گئیں۔ تب تھک کر میں نے اس بازاری قحبہ سے معاملہ کیا۔ دیکھتا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا، دلقک نے کہا کہ:

گفت نے مستورۂ صالح خاستم قحبہ گشتند وزغم من کاستم

اس لطیفے کا ذکر حضرت مولانا نے اپنے اس مشہور شعر کے بعد فرمایا۔ یعنی

ازمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

جب عقل پر بھروسہ کیا دھوکہ اٹھایا، آخر جنون میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔

دوسرا لطیفہ اسی سلسلے میں "مست" کا تھا۔ جو دیوار کے پیچھے پڑا قے کر رہا تھا۔ محتسب نے دھر لیا، ابے کون ہے؟ تو نے کیا پی لیا ہے؟ مست نے کہا جو اس گھڑے میں ہے۔ گھڑے میں کیا ہے؟ محتسب نے پوچھا! مست نے کہا جو میں نے پیا ہے۔ محتسب نے کہا یہ دور والی گفتگو کیا کرتا ہے چل جیل خانے۔ مست نے کہا:

گر مرا خود قوت رفتن بدے خانہ خود رفتمے دیں کے شدے

اسی تاریخ میں دوسری مجلس میں جانے کا شرف حاصل ہوا۔ بہلول دانا کا قصہ بیان فرما رہے تھے کہ بانس پر چڑھ کر بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ جو کوئی بات پوچھتا تو کہتے جلدی ہٹو میرا گھوڑا کہیں لات نہ رسید کرے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اس عقل و دانش کے ساتھ اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟ فرمایا کہ میاں! اس شہر کے لوگوں کا اصرار ہے کہ میں ان کے شہر کا قاضی بن جاؤں مگر اس دردسری کو کون خریدے؟ اپنے خزانوں کو میں نے جنون کے گھوڑے کے نیچے دبا دیا ہے۔ الحمدللہ کہ مجھ میں ''شکر'' پیدا ہوئی ہے اور شکر سے خود ہی لذت اندوز ہوتا ہوں:

کانِ قندم نیستانِ شکرم　　　　ہم زمن می روید من خورم

بہلول دانا نے کہا کہ میرا علم تقلیدی نہیں ہے تحقیقی ہے۔ تقلیدی علم کے متعلق فرمایا کہ عوام وخواص میں روشناس ہونے کے لیے یہ علم حاصل کیا جاتا ہے، اس علم سے غرض یہ نہیں ہوتی کہ:　　نے کہ تا یابد ازیں عالم خلاص

تقلیدی علم یا ایسی گفتگو جو تقلیدی ہوتی ہے اس میں جان نہیں ہوتی، صرف اپنے خریداروں کے عشق میں ایسا آدمی گھومتا پھرتا ہے۔ رونق اسی وقت تک اس علم کی رہتی ہے جب تک خریدار اس کے ملتے ہیں۔ خریدار غائب، علم بھی غائب۔ پس مناسب یہی ہے کہ ان فانی خریداروں کی تلاش چھوڑو اور اس علم کو حاصل کرو جو باقی سے رشتہ ملائے۔ یہ مفلس خریدار کیا خریدیں گے؟

ایں خریداران مفلس را بہل　　　　چہ خریداری کند یک مشتِ گل

گل مخر گل مخور گل را مجو　　　　زاں کہ گل خوارست دائم زرد رو

پس ''گل خری'' سے دست بردار ہو کر ''دل خری'' میں غرق ہو جاؤ۔ (دفتر دوم)

فانی انوار لائقِ التفات نہیں:

۴ ستمبر یوم الجمعہ بعد الاوراد: حضرت مولانا معنوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور

دریافت فرمانے لگے بجلی جانتے ہو کس پر ہنستی ہے؟ خود فرمایا ان ہی لوگوں پر جو برق کے نور پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں۔ پھر فرمانے لگے سمندر کے کف پر گھوڑے کو جو دوڑاتا ہے ڈوبے گا یا پار ہوگا؟ برق کی روشنی میں خط کا پڑھنے والا کیا خط پڑھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟

ارشاد ہوا کہ

نورِ حس پر ٹیک لگا کر بیٹھ نہ جانا چاہیے۔ دراصل یہ وہ نور نہیں جو نہ شرقی ہے، اور نہ غربی، بہر حال حق تعالیٰ سے ہٹ کر کوشش کرنے والے کی حالت ایسی ہی ہے کہ

برکف دریا فرس را راندن ‌ ‌ ‌ نامہ را در نور برقی[1] خواندن

از حریصی، عاقبت نادیدنست ‌ ‌ ‌ بر دل و بر عقل خود خندیدنست

دریافت فرمایا کہ

آخر عقل و ہوش رکھتے ہوئے دریا کے پھین (کف) پر لوگ گھوڑے کیوں دوڑا رہے ہیں، کیا ان کے پاس عقل نہیں ہے؟

ارشاد ہوا کہ

عقل تو ان کے پاس بھی ہے اور عقل کا اقتضا یہی ہے کہ انجام کو نظر سے اوجھل نہ ہو دے مگر:

عقل کو مغلوبِ نفس، او نفس شد

فرمانے لگے کہ

موجودہ زندگی لمحے لمحے میں مختلف حالات سے جو گزرتی رہتی ہے جانتے ہو اس کا راز کیا ہے؟

فرمایا کہ

ضد سے ضد کی پیدائش کا سلسلہ حالات کی قلابازیوں میں جاری رہا ہے راز یہ ہے کہ:

تا کہ از عسریٰ نہ بینی خود فہا ‌ ‌ ‌ کہ زیسریٰ باز یابی لطفہا

---

(۱) ہمارے زمانے میں "نور برقی" کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اب سب کچھ اسی میں پڑھا جاتا ہے۔ مولانا کے عہد میں بادل والے "برق" کے سوا اور کوئی برقی روشنی نہ تھی۔ آج کا آدمی اس شعر کو پڑھ کر تعجب کرے گا۔ یہ زمانہ یوں ہی بدلتا رہتا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی)

بائیں طرف سے خوف پیدا ہوتا ہے مگر داہنے جانب سے امید کی توقع مردانِ خدا کرتے ہیں, مقصد یہ ہے کہ ''بیم وامید'' کے دو پروں سے آدمی اڑے، ایک پروالا پرندہ اڑے گا کہ گر پڑے گا؟

تادو پر باشی کہ مرغ یک پرہ عاجز آمد از پریدن سرہ

پھر مولانا نے کچھ اشارے میں گفتگو کی:

ابراہیمی نور اگر ہو تو ''نار'' میں بھی ''گل زار'' کو پالیتا ہے اور فانی انوار کے مظاہر پر پاؤں رکھتے ہوئے بالآخر نور الانوار تک پہنچ جاتا ہے:

چوں خلیل از آسمان ہفتمی بہ گذرد کہ لااحب الآفلین

(دفتر دوم)

دنیوی واخروی سزا کا فرق:

۲۳ دسمبر ۱۹۵۰ء: بعد نماز عید الاضحیٰ مولانا معنوی کی مجلس مبارک میں حاضری کی آرزو پیدا ہوئی، فاتحہ خوانی کا الہام ہوا، عمل کیا گیا۔ حاضر ہو گیا فرما رہے تھے:

خواب میں بُری بھلی باتیں جو دیکھتے ہو قیامت میں یہی باتیں اچانک تمھارے سامنے آجائیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ موجودہ زندگی کے خواب میں جو کچھ دیکھ رہے ہو حشر کی بیداری میں وہی سب سامنے آجائیں گے۔ میں اس لیے یہ سمجھا رہا ہوں کہ آج کی بدکاریوں کو یہ سمجھ کر ٹال دینا کہ یہ تو خواب کی باتیں ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اس خواب کی ایک تعبیر ہے، موجودہ زندگی کی ہنسی کی تعبیر گریہ کی شکل میں نکلے گی !اور یہاں کے رونے دھونے اور آہ وزاری کی تعبیر حشر میں بیداری کے وقت بہ شکلِ شادمانی نکلے گی۔''

جوش میں فرمانے لگے:

''ارے یوسف کی پوستین پھاڑنے والو! یاد رکھو کہ بھیڑیے کی شکل میں اپنے آپ کو پاؤ گے جب زندگی اس گہری نیند سے جاگ گئی ہوگی۔ یہ تمھارے باطنی اخلاق دراصل

مستقل بھیڑیے ہیں جو تمھارے اندر دبکے ہوئے ہیں اور تمھاری بوٹیاں وہ اڑا رہے ہیں۔
پھر یہ الہامی مصرع زبان مبارک پر جاری ہوا کہ۔ ع

تو مگر کہ میرم دیابم خلاص''

موت کیا ختم کرے گی تمھارے اعمال کے نتائج کو؟ موت کو نجات کا ذریعہ سمجھنے والے موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ (موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ یہ ایک بے بصیرت شاعر کا کلام ہے۔ مناظر احسن گیلانی نے فرمایا، موت بظاہر تم پر نیند طاری کرتی ہے لیکن تم نے خدانخواستہ اگر خون کیا ہے تو موت کی نیند کے ساتھ ہی وہ جاگ اٹھتا ہے۔ قتل کے مجرم کو قصاصًا دنیا میں جو قتل کیا جاتا ہے یہ جرم کی حقیقی سزا نہیں ہے[1] بلکہ جرم کی حقیقی سزا کے مقابلے میں تو یہ کھیل ہے انما الحیوٰۃ الدنیا لھو و لعب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ

کہ ایں جز العبے پیش آں جزا

مقصود قصاص کا یہ ہے کہ دوسروں کی ہمت سرد کر دی جائے۔ فتنہ آگے نہ بڑھے۔ لوگوں کو عبرت ہو۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ قتل ہو کر مجرمِ قتل اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا دھوکہ اور صرف دھوکہ ہے بلکہ اصلی سزا اس کی اس کے آگے بعد الموت حشر کے وقت نمایاں ہوگی۔ دنیا والے قصاص کی سزا اور آخرت والی سزا کے فرق کو ایک دلچسپ مثال سے سمجھایا کہ آخرت والی سزا تو خصی بنانا ہے، اور دنیا کی سزا کی حیثیت ختنے کی ہے۔ خصی جسے بنا دیا جاتا ہے اس سے بھی کچھ نکالا جاتا ہے اور کاٹا جاتا ہے اور ختنے میں بھی کاٹا اور چھچھڑا حلقے کا الگ کر دیا جاتا ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے :

آں چو اخصا است و ایں چوں ختنہ است

---

(1) بشرطیکہ مجرم اپنے جرم سے تائب نہ ہو بلکہ پکڑ دھکڑ کر اس کو قتل کیا گیا ہو ورنہ اگر مجرم خود تائب ہے اور اجرائے حد کو اپنے حق میں سزائے آخرت سے تحفظ کا ذریعہ سمجھتا ہے ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ حدیث شریف میں ایسے تائب کامل کی مدح آئی ہے۔ (مرتب)

"لاتتکفر وافی الخالق" کا مطلب:

پھر قصہ موسیٰ علیہ السلام جو پہلے سے بیان ہو رہا تھا اس کی تفصیل میں مشغول ہو گئے۔ اس قصے میں یہ بات عجیب فرمائی:

کاں شبے کومی ندید مدلیش فاش   بود یا ایشاں نہاں اندر معاش

"معاش" والی زندگی میں خود خدا پوشیدہ ہے جیسے عقل تمھارے کاروبار میں پوشیدہ ہے۔ عقل اور نفس میں فرق یہ ہے کہ عقل بیدار رہتی ہے۔ اس لیے مجرم کو ملامت کرتی ہے لیکن نفس پر نیند طاری ہے، حق تعالیٰ عقل کے قریب ہے لیکن اس قرب کی نوعیت مجہول ہے۔

تم سو جاتے ہو، لکھنے کی قوت انگلیوں سے غائب ہو جاتی ہے۔ بیداری میں واپس آتی ہے، کیسے آتی ہے؟ یا تمھاری آنکھ میں "نور" کس راہ سے داخل ہوا؟ جب یہ ہی معلوم نہیں تو تمھارا خالق تمھارے اندر تمھارے کاروبار میں کس طرح شریک ہے؟ اس کو کیسے جان سکتے ہو؟ بہرحال نور آنکھوں میں آیا۔ کس راہ سے آیا، پورب سے آیا، پچھم سے آیا، اتر سے آیا، نیچے سے آیا؟ کیا جواب ہے:

بے جہت داں عالم امر وصفات   عالم خلق است با سوئے جہات

الامر والخلق عالم کی ان دو قسموں میں بھی فرق ہے؟ پھر فرمایا کہ تمھاری عقل:

بستۂ فصلت و وصل ست ایں خرد   ایں تعلق را خرد چوں پے برد

الحاصل عقل ایسے قدرتی قوانین میں جکڑی ہوئی ہے کہ "خالق" کو اپنی گرفت میں نہیں لاسکتی۔ پس

جز کہ لا احصی نگوید اوز جاں

لاتتفکروا فی الخالق کا مطلب یہی ہے______ (مجلس ختم ہوگئی)

(دفتر چہارم)

دنیوی نظام اضداد پر قایم ہے:

۱۲ اکتوبر ۱۹۵۱ء: بعد نماز جمعہ مولانا معنوی کی طرف دل نے کشش محسوس کی۔مجلس مبارک میں حاضر ہوا۔ارشاد ہو رہا تھا:

بھائی! میرا کام تو کہنا ہے، کہتا رہوں گا، بلا تار ہوں گا۔

لیک دعوت داردست زکردگار   با قبول و نا قبول اور اچہ کار

اللہ کے پیغمبر سیدنا نوح علیہ السلام نو سو سال اسی فرض کو انجام دیتے رہے، قوم نے نہ مانا تو کیا دعوت انھوں نے ترک کر دی؟ کتوں کے بھونکنے سے کارواں کہیں کبھی رکا ہے؟ یا چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر کتے عوعو کرتے ہیں پھر چاند کی حرکت کبھی سست پڑتی ہے؟

فرمایا کہ بے شک نہ ماننے والوں کے انکار سے تکلیف پہنچتی ہے لیکن ان کا انکار جہاں سرکہ پیدا کر رہا ہے تو پیدا کرنے والا اسی مقدار میں ''شہد'' بھی اس میں ملا دیتا ہے۔ پس نفسیاتی سکنجبین بن جاتی ہے:

چوں کہ سرکہ سرکگی افزوں کند   پس شکر را واجب افزائی بود

یہ شہد کہاں سے آتا ہے''خم'' (دل کے) اندر ایک باطنی راستے سے دریا (ذات حق) سے آتا ہے۔فرمایا کہ میاں! عالم کا یہ محسوس نظام اضداد پر قائم ہے، جنگ و صلح فعل میں، قول میں، طبیعت میں ان ہی اضداد کا نام ہے:

ایں جہاں جنگ است چوں کلی بنگری   ذرہ ذرہ چودیں باکافری

ہاں! ذرہ آفتاب میں جب محو ہو جاتا ہے تو اب آفتاب سے جنگ ختم ہو جاتی ہے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون کی حقیقت ذرّے کو آفتاب بنا دیتی ہے۔

ہاں! جب موجودہ نظام ختم ہو جائے گا اور دوسرا نظامِ عالم قائم ہوگا تو اس کی بنیاد اضداد پر نہ ہوگی۔یہاں تو ضد ضد کو کھائے جاتی ہے اور وہاں ضد ہی نہیں ہے تو بقا کے سوا اور ہوگا کیا؟ **لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا** کی آیات میں اسی طرف اشارہ ہے

کہ وہاں اضداد نہیں ہیں۔

وصولِ حق کے لیے مدت کا سوال بے معنی ہے:

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء: آج جمعہ کا دن ہے اور اورادِ یومیہ کے بعد خیال گزرا کہ مولانا معنوی کی مجلس میں حاضری کی سعادت حاصل کی جائے۔ نیا خیال یہ آیا کہ مثنوی کھولنے سے پہلے فاتحہ مولانا کے نام پڑھ لینا چاہیے تو مناسب ہے۔ سورہ فاتحہ اور ثلث قرآن (الاخلاص) کو تین دفعہ پڑھ کر ثواب مولانا کی روح کو ایصال کیا گیا اور مثنوی شریف کھولی، قصہ بیان ہو رہا تھا اس شاہ زادے کا کہ توفیقِ ربانی جس کی رفیق بنی۔ مولانا نے طویل عنوان اس قصے کا خود ارقام فرمایا ہے جو بجائے خود عبرتوں سے معمور ہے۔ شاہ زادے پر وہی دن جو کل آنے والا ہے جس میں بھائی بھائی سے بھاگے آج ہی آ گیا، اس پر واضح ہوا کہ تیس مار خانوں کا طبقہ جو تو دۂ خاک اور مٹی کے ڈھیر کو قبضے میں لا کر قلعہ کشائی کا اعلان کرتا ہے۔ دراصل ''کودک طبعی'' ہی کا اس کے یہ نتیجہ ہے! بچے مٹی کے گھروندے بناتے ہیں، کوئی بچہ گھروندا بنا کر آواز بلند کرتا ہے کہ دیکھو! یہ میرا قلعہ ہے۔ کوئی اس کے گردنہ پھٹکے۔ اور کم زور بچے رشک و حسد کی نگاہ سے اس قلعے کے فاتح کو دیکھتے ہیں۔

ارشاد ہوا کہ:

''رنگ کے مغالطے سے بادشاہ کی روح نے خلاصی حاصل کی۔ کہنے لگا یہ سونا یہ اطلس یہ سب کیا ہے؟ صرف مختلف رنگ کے مظاہر کے مختلف نام ہیں۔ ورنہ سچ پوچھو تو ''خاک ہائے رنگین'' کے سوا ان کی اصل حقیقت اور کچھ نہیں ہے۔ شاہ زادے نے ایک ''ہو'' کے ساتھ چھلانگ لگائی اور رنگ و بو کے عالم سے اچانک نکل بھاگا''۔

مولانا نے فرمایا:

''گو شاہ زادہ نوعمر تھا لیکن اٰتیناہ الحکم صَبِیاً (بچپن ہی میں فیصلے کی صحیح قوت عطا کی گئی) کی نعمت سے یحییٰ علیہ السلام جیسے سرفراز ہوئے تھے کچھ یہی سلوک قدرت نے شاہ زادے کے ساتھ کیا۔''

پھر فرمایا کہ :

''وصول'' کے لیے وقت اور مدت کا سوال دربار میں بے معنی ہے، جہاں کے کاروبار کی بنیاد کن فیکون کے حکم پر قائم ہے۔لوگ ''فضل'' کے لیے قابلیت کی شرط لگاتے ہیں لیکن ''کن فیکون''حدود میں بے محل ہے۔''

پھر کہانی شروع ہوئی، مختصر کہانی یہ ہے کہ کسی بادشاہ کا ایک ہی لڑکا بڑا نیک بخت فرزندِ سعید تھا۔خواب میں بادشاہ نے دیکھا کہ وہ مر گیا، اکلوتے اور ایسے سعادت مند بچے کی موت کا اثر خواب ہی میں بادشاہ پر جو ہو سکتا تھا ہوا۔مرنا چاہتا تھا لیکن موت بھی نہیں آتی تھی کہ اچانک بیدار ہو گیا، جس قسم کا غم ہوا تھا جاگنے کے ساتھ ہی اس قسم کی مسرت اور خوشی بھی اس کو ہوئی۔

مولانا نے فرمایا کہ:

''غم بھی ایسا غم ہوا کہ مرنا چاہتا تھا اور خوشی بھی ایسی ہوئی کہ مارے خوشی کے دم نکلا جاتا ہے۔''

مسرت والم کے درمیان زندگی قائم ہے:

خاکی بدن کے ساتھ اس جان کے تعلق کی نوعیت بھی عجیب ہے۔شدت غم میں بھی ٹوٹنے کے قریب ہو جاتا ہے اور فرطِ خوشی میں بھی روح قالب سے نکلنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہے۔فرمایا کہ:

''جان اس جسم کے ساتھ کچھ عجیب طرح سے لٹکی ہوئی ہے، غم کے پھونک سے بھی یہ چراغ بجھنے لگتا ہے اور خوشی کی پھونک سے بھی گل ہونے لگتا ہے''۔

الغرض مسرت والم کی ان ہی دونوں موتوں کے خطرے کے بیچ میں ''جان زندہ'' ہے:

درمیان ایں دومرگ او زندہ است
ایں مطوّق شکل جائے خندہ است

موت کی ان دو گرفتوں میں جکڑی ہوئی جان کا یہ تماشہ کتنا دلچسپ ہے۔

فرقِ نظر ہی سے ایک شے موت بھی ہے اور زیست بھی:

ایسے غم ناک خواب کو قدرت نے اس لیے دکھایا کہ جس سے بڑی خوشی بادشاہ کو ساری زندگی میں میسر نہ آئی تھی وہ حاصل ہو۔ اسی لیے اس عالم کے حالات کو سمجھو ایک ہی چیز ہے۔ ایک رخ سے دیکھو تو موت ہے اور موت ہی دوسرے رخ سے ساز و سامان کا وہی سرمایہ بن جاتی ہے۔ خوابوں میں بھی یہی ہوتا ہے کہ رونے کی تعبیر ہنسنا ہے۔

قصہ پھر شروع ہوا، بیداری کے بعد بادشاہ کو جو خوشی حاصل ہوئی تو سوچنے لگا کہ خواب میں جس قسم کا شکار ہو گیا تھا اس کے سدِّ باب کی کوئی تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔ آخر پھول بیداری میں سامنے آیا، کیا ضمانت ہے کہ اسی زندگی میں کانٹا نہ چبھے گا۔ آخر کچھ تو کرنا چاہیے، کانٹا جس وقت چبھے تو پھول نہ سہی ۔۔۔۔ پھول کی یادگار ہی سامنے ہو۔ بادشاہ سوچتا تھا کہ اس دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک سوراخ سے تباہی آنے والی ہو تو اس کو روکنے کے اسباب بے شمار ہیں۔

ہم پس کدامیں رہ رابندیم ما؟

آفات و بلیات موت کی دھمکیاں ہیں:

مولانا نے فرمایا:

''دیکھو! سینکڑوں دریچے کھلے ہوئے ہیں جن سے موت جھانک رہی ہے، ان دریچوں کے کواڑوں کی آوازیں کیا ہیں؟ موت کی دھمکیاں ہیں جو مختلف آفتوں اور بیماریوں کی شکل میں سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن حرص کی چربی سب کی آنکھوں اور کانوں پر چڑھی ہوئی ہے۔ وہ ان کواڑوں کی آواز سے بہرے بنے ہوئے ہیں۔''

مولانا نے فرمایا:

''میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ مرنے کے سو بہانے ہیں، اس کا اندازہ طب کی کتاب سے

نہیں ہوگا۔ریت کی مانند امراض نظر آئیں گے جن میں آدمی گرفتار ہوتا رہا ہے۔گویا آدمی کے بدن کو ایک پنجرہ اگر فرض کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہزاروں سوراخ اس پنجرے میں ہیں جن کی راہ سے موت اندر داخل ہوسکتی ہے۔زندگی کے ہر قدم پر بچھوؤں سے بھرے ہوئے چوبچے نظر آتے ہیں'':

ہر دو گامے پر زگومہا چہ است''

عقل مند وہ ہے جو دل کا چراغ جلالے:

اسی لیے مناسب ہے کہ جھکڑ میں بجائے ایک چراغ کے چند چراغ آدمی جلالے تاکہ ایک بجھ جائے تو شاید دوسرے سے کام چلے۔

فرمایا کہ :

''جو دانش مند ہیں وہ اسی لیے جسم کے ٹمٹماتے چراغ کے ساتھ دل کے چراغ کو بھی روشن کر کے رکھ چھوڑتے ہیں۔مطلب ان کا یہی ہوتا ہے کہ بدن کا چراغ اگر بجھ جائے تو دل والا چراغ جلتا رہے''۔

الولد سِرٌّ لابیہ کی توضیح:

القصہ بادشاہ اسی سوچ بچار میں تھا،سمجھ میں کوئی صورت نہ آتی تھی،آخر اس نے فیصلہ کیا کہ شاہزادے کی شادی کردی جائے تاکہ شاہزادہ نہ رہے تو اس کی نسل باقی رہے فرمایا کہ:

''صورت کو موت ختم کر دیتی ہے لیکن معنی اولاد کی شکل میں باقی رہتا ہے **الولد سر لابیہ** (بیٹا باپ کا بھید ہے) اس قول نبویؐ کا یہی مطلب ہے۔''

ارشاد ہوا کہ:

''لوگ اپنا ہنر پیشہ اپنے بچے کو اسی لیے سکھاتے ہیں کہ ان کی صورت جب مٹ جائے تو معنی ان کا یا کمال ان کا زندہ رہے۔''

تب بادشاہ نے طے کیا کہ کسی صالح صاحب سیرت و کردار بزرگ سے کوئی لڑکی

حاصل کی جائے جس سے شاہ زادے کا عقد کر دیا جائے۔ کیونکہ کسی بد کردار بادشاہ کی لڑکی سے اچھی نسل کی پیدائش کی امید درست نہ ہوگی۔

مولانا نے فرمایا کہ :

''چہ خوش (یعنی کیا خوب) جو بے چارہ مال و جاہ کا غلام اور قیدی ہے اسی کو لوگوں نے بادشاہ کا نام دے رکھا ہے۔ دیوانے زنگی کو کافور کے نام سے موسوم کر رہے ہیں اور بادیہ کو عرب والے ''مفامرہ'' (کامیابی کا میدان) کہتے ہیں۔ کہتے صدر اجل ہیں جسے وہ دراصل:

صدر خوانندش کہ در صف بغال   جان او بستہ یعنی جاہ و مال

اصلی فقیر اور بھیک منگے کا فرق:

بیگم کو علم ہوا کہ اس کے بیٹے کا عقد کسی فقیر ٹٹ پونجیے سے بادشاہ کرنا چاہتا ہے تو برہم ہو کر بولی کہ ''کفو'' کا مسئلہ تو عقلاً و شرعاً ایک مسلّم بات ہے۔ بیگم نے یہ طعنہ بھی دیا کہ خرچ کے خوف سے روپیہ بچانے کے لیے تم بجائے بادشاہوں کے کسی فقیر کی لڑکی کی تلاش کر رہے ہو؟ بادشاہ نے بیگم سے کہا کہ تم نے بھیک منگوں کو قیاس کیا جن کے فقر و ناداری کے نیچے قلبی غنا کا جذبہ کام کرتا ہے سمجھایا کہ فقیر کو دیکھو!

فقیر کی شناخت کا معیار:

ایک پیسہ مل جانے پر لوٹتا ہے تو سمجھو کہ اس کے پیچھے قناعت نہیں ہے اور جو خزانوں پر لات مارے یہی فقیری بادشاہی پر بھاری ہے۔ بیگم نے کہا کہ لڑکی کا فقیر باپ دان جہیز کیا دے گا؟ ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی؟ بادشاہ نے کہا، اور وہی اس قصہ کی جان ہے کہ

غم سے نجات کی راہ:

دین کو جس نے غم بنالیا سارے غموں سے آزاد ہو گیا، دین کو جس نے شکار کر لیا یقین کر حسن و مال بخت سب طفیل میں دین کے اس کو مل جاتے ہیں۔ اونٹ آگے آگے چلتا ہے اور اس کی مینگنی پیچھے پیچھے آتی ہے۔

فرمایا:

پشم بہ گز مینی شتر منبود ترا　　　　در بود اشتر چہ پشم را

اون ہی پر قناعت کر کے جو بیٹھ جائے گا تو اونٹ سے وہ محروم رہے گا لیکن اونٹ کے خریدنے والے کے سامنے اون کی کیا قیمت باقی رہتی ہے؟

حضور اکرم ﷺ کا طریقِ اصلاح سراسر رحمت ہے:

۳ نومبر ۱۹۵۰ء: عربی اور فارسی کی کمیٹی میں شریک ہونے کے لیے پٹنہ (بہار) کے عاصمہ میں بلایا گیا تھا، واپسی کے بعد آج مولانا روم کی خدمت میں حاضری کی آرزو پیدا ہوئی، آرزو والحمدللہ پوری ہوئی۔ ایک دلچسپ حکایت بیان کر رہے تھے کہ ایک سوار گھوڑے پر جا رہا تھا، نظر اس کی پڑی ایک شخص پر جو سویا ہوا تھا، اور ایک سانپ اس کے منہ میں گھسا ہوا تھا، اس منظر کو دیکھ کر سوار کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوائے اس کے کہ جو دبوس اس کے ہاتھ میں تھا اسی سے سونے والے کے منہ پر مسلسل اس نے چند ضربیں لگائیں۔ سونے والا غریب چونک کر اٹھا، دیکھا کہ ایک سوار مسلسل اس کے منہ پر دبوس مار رہا ہے۔ اچھل کر بھاگا، ترک سوار پیچھے پیچھے اس کو رگیدتے ہوئے دبوس پر دبوس مارتا چلا جاتا تھا۔ بھاگ کر سیب کے ایک درخت کے نیچے پہنچا جس کے نیچے بہت سے سیب گرے پڑے تھے، سپاہی نے کہا کہ اس سیب کو کھا، بے چارہ کھاتا تو منہ سے واپس ہو جاتا، آخر چلا کر سونے والا سپاہی کہنے لگا کہ بھائی آپ کا کیا قصور میں نے کیا کہ مجھے اس طرح بلا وجہ آپ ستا رہے ہیں، اگر مجھ سے خواہ مخواہ کی عداوت ہی ہو گئی ہے تو بجائے دبوس کے زیادہ مناسب ہے کہ تلوار سے میری گردن اڑا دو، آخر آج کس کم بخت کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا کہ اس حال میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سپاہی کو سونے والا طرح طرح کی بری بھلی باتیں کرتا جاتا اور بھاگتا جاتا تھا لیکن سپاہی بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سونے والا اٹھتا اور گرتا دبوس کی مار کھاتا، آخر جو کچھ اس کے پیٹ میں تھا قے کی شکل میں باہر آنے لگا اور اسی کے ساتھ سانپ بھی سونے والے کے منہ سے باہر گر پڑا۔ سانپ پر جب سونے والے کی نظر پڑی تو ہوش اڑ گئے اور سپاہی کے احسان

کے نیچے اپنے آپ کو دبا پایا۔ مولانا فرماتے تھے کہ سونے والے نے کہا کہ آپ تو میرے لیے رحمت کا فرشتہ ہیں یا خدا ہیں، ولی نعمت ہیں، اگر یہ سانپ میرے پیٹ سے نہ نکلتا تو میرا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کیسی مبارک ساعت تھی کہ آپ میرے سامنے آئے، میں تو مر چکا تھا، مجھے دوبارہ زندگی آپ ہی نے بخشی ہے۔ اس موقع پر مولانا کے بعض اشعار یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ سونے والا دبوس مارنے والے کو کہہ رہا تھا:

اے خنک آں کہ بیند روئے تو یاد رافتدنا گہاں در کوئے تو
تو مرا جویاں مثالِ مادراں من گریزاں از تو مانندِ خزاں

فرمانے لگے کہ :

''دھوبی بے چارہ گدھے کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے، اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ بھیڑیا کہیں اسے پھاڑ نہ ڈالے، مگر گدھا گدھا ہی ہوتا ہے وہ دھوبی کو دیکھ کر بھاگتا ہے''۔

بہ ہر حال سونے والے نے سپاہی سے پھر معذرت چاہی کہ نادانی میں خدا جانے آپ کو میں نے کیا کچھ کہہ دیا۔ کاش! آپ اس بات کو کہ میرے منہ میں سانپ گھس گیا ہے فرما دیتے تو میری کیا مجال تھی جو اس طرح کی بے ہودہ باتیں زبان سے نکالتا مگر آپ نے خاموشی کے ساتھ میرا علاج شروع کر دیا، اسی سے غلط فہمی ہو گئی۔ سپاہی نے تب جواب میں کہا کہ بھائی! اگر اصل راز سے تم کو آگاہ کر دیتا تو ڈر تھا کہ مارے ڈر کے تمھاری روح نہ کہیں پرواز کر جائے:

گر ترا من گفتمے اوصاف مار ترس از جانب برآوردے دمار

قصہ ختم کر کے حضرت فرمانے لگے کہ دیکھو انسانیت کے اندر جو دشمن چھپا ہوا ہے اگر اس کے تفصیلی حالات سے رسول اللہ ﷺ دنیا کو آگاہ فرما دیتے تو لوگوں کا زہرہ آب ہو جاتا۔ اسی لیے بجائے کہنے کے لوگوں کی تربیت اس طریقے سے پیغمبر کرتے ہیں کہ مرض کا ازالہ ہو جائے اور مرض کی نوعیت سے وہ بے خبر رہتے ہیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دوست بنا کر ان کے ہاتھ کو پیغمبر ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لیا تب ریاضت کے ہتھوڑے

سے ان کو درست کرنا شروع کیا، جو بات ناممکن ہوتی تھی وہی ان کے لیے حال بن گئی اور
جن پرندوں کے بازوؤں کے پر اکھڑ گئے تھے پھر ان میں نئے بال و پر پیدا ہو گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ :

پیغمبر کا ہاتھ:

''جس پر اللہ کا ہاتھ ہے اس کی درازی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ چاند کے ٹکڑے
پیغمبر کے اسی ہاتھ سے ہوئے اور یہ بھی معمولی بات ہے ورنہ پیغمبر کے مقدس ہاتھ کی
رسائیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔''

بہ ہر حال سپاہی نے کہا کہ بھائی! جو واقعہ تھا اگر اس کا اظہار کر دیتا تو جس جان کو بچانا
چاہتا تھا وہی جان نکل پڑتی، نہ تم میں کھانے ہی کی قوت باقی رہتی اور نہ قے کرنے کی
صلاحیت ہی اپنے اندر تم پاتے، تم جس وقت مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے اس وقت میری
زبان پر ''رب یسر'' کا وظیفہ جاری تھا:

می شنیدم فحش و خرمی راندم ''رب یسر'' زیر لب می خواندم

سپاہی نے کہا:

از سبب گفتن مرا دستور نہ ترک تو کردن مرا مقدور نہ

نہ سبب ہی بیان کر سکتا تھا اور نہ یہ بس میں تھا کہ تمھیں چھوڑ دیتا:

ہر زماں می گفتم از درد دروں اھد قومی انھم لا یعلمون

گویا پیغمبر کا حال امت کے ساتھ کچھ اسی رنگ میں ہوتا ہے، جب ہدایت پانے کے
بعد آدمی دیکھتا ہے کہ پیغمبر نے سانپ سے بچالیا کہتا ہے:

دشمنی عاقلاں زینساں بود زہر ایشاں ابتہاج جاں بود

(دفتر چہارم)

استقامت ہی کامیابی کی ضامن ہے:

۷ نومبر ۱۹۵۰ء: مولانا روم کا خیال آیا، حاضری دی گئی۔ ارشاد ہو رہا تھا کہ ایک

مسکین عشق کے مرض میں مبتلا ہوا، ایک عورت پر اس کی طبیعت آ گئی، خواب وخور غریب پر حرام ہو گئے۔

مولانا نے فرمایا کہ :

''عشق کا قاعدہ ہے کہ شروع میں ذرا سخت پکڑتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ
تا گریز داں کہ بیرونی بود''

اس عاشق کا یہ حال تھا کہ جس راستے سے محبوبہ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا کامیابی نہ ہوتی تھی، قاصد کو بھیجتا تو وہ راہزن بن جاتا، خط لکھتا، پڑھنے والے غلط سلط سنا دیتے، کبوتر کے پر میں خط باندھ کر بھیجتا تو پر ہی وہ گر پڑتا جس میں نامہ بندھا ہوتا تھا، الغرض تدبیر کی ساری راہیں اس پر بند ہو گئیں اور سوچ بچار کی جو فوج اس کے اندر تیار ہوتی رہتی تھی اس کا جھنڈا ہی گر گیا۔ پہلے تو اس کے غم کی تسلی انتظار کے جذبے سے ہوتی، اب انتظار بھی اس کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔۔۔۔اس کے بعد اس کا حال عجیب تھا، کبھی سمجھتا کہ میرا مرض لا علاج ہے اور کبھی جوش میں آتا تو اپنے عشق کو سرمایۂ حیات قرار دیتا۔ الغرض کبھی آسمان پر رہتا اور کبھی زمین پر گرتا۔

آخر میں اسی بے سروسامانی کو اس کے لیے سامان بنا دیا گیا اور اپنے عشق کے ساتھ مانوس ہو گیا۔ باہر سے مغموم نظر آتا لیکن اندر سے اس کے مسرت ونشاط کا چشمہ ابلتا رہتا تھا۔
مولانا نے فرمایا کہ :

''سارے بنی آدم جن سے تم ملتے جلتے رہتے ہو ان کے اندر کا حال تم کو معلوم نہیں، کتنے بولنے والے جو طوطی کی طرح بولنا چاہتے ہیں، خاموش نظر آتے ہیں اور بہت سے چہرے جو دیکھنے میں تلخ وتُرش نظر آتے ہیں ان کی جان میں مٹھاس ہی مٹھاس ہوتی ہے۔''
فرمایا کہ :

''قبرستان میں چلے جاؤ، ساری قبروں میں تم کو باہر سے خاک ہی خاک نظر آئے گی،

لیکن دراصل ان قبروں کا حال ایک سا نہیں ہے۔ جیسے گوشت و پوست تو ہر آدمی میں مشترک ہوتا ہے لیکن گوشت و پوست کے ان ہی ڈھانچوں میں کتنے غمگین بھی ہوتے ہیں اور کتنے فرحاں وشاداں بھی۔''

فرمانے لگے کہ:

تو چہ دانی تا نوشی قال شان

جب تک آدمی لوگوں کی گفتگو نہ سنے تو جس طرح وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر کیا ہے، یہی حال اس دنیا کی اکثر چیزوں کا ہے۔ درخت ہلتا ہے کلہاڑی کی ضرب سے بھی اور بادِ صبا کے جھونکے سے بھی، پھر کیا ہلنے کی یہ دونوں حالتیں برابر ہیں؟ اسی طرح جوش نوش تو سب دکھاتے ہیں مگر کس میں سچائی ہے اور کون دکھاوے سے کام لے رہا ہے؟ اس کے لیے ضرورت ہے ع

رو دماغی دست آور، ابو شناس

مولانا نے فرمایا کہ خیر، ہوا یہ کہ آخر آٹھ سال گزرنے کے بعد اس عاشق کی رسائی اپنی محبوبہ تک ہوگئی جس کی وجہ وہی تھی کہ اپنے مقصد پر وہ ڈٹا رہا:

سایہ حق بر سر بندہ بود — عاقبت جوئندہ یابندہ بود
گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے — عاقبت زاں در بروں آید سرے

یعنی بندے پر حق کا سایہ رہتا ہے اور ڈھونڈنے والے پا لیتے ہیں، جس دروازے کو کھٹکھٹاؤ گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے سر نمودار ہوگا۔

مولانا فرمانے لگے کہ:

''بھائی یہ ناممکن ہے کہ کسی گلی میں تم کسی کے انتظار میں بیٹھو اور جس کا انتظار کر رہے ہو اس کا چہرہ نظر نہ آئے۔''

چوں نشینی بر سر کوئے کسے — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

کہنے لگے:

کسی کنویں سے مسلسل مٹی نکالنے والے کے سامنے آخر کسی نہ کسی دن پانی ضرور جھلک پڑے گا۔

سمجھانے لگے کہ :

''عام قاعدہ یہی ہے کہ کوشش سے نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔کبھی اس کے خلاف بھی کوئی پیش آئے تو یہ ایک استثنائی بات ہوگی۔آدمی کو چاہیے کہ شذ وذ اور نادر مثالوں سے متاثر نہ ہو، یہ نہ کہے کہ شیطان نے اتنے دن سر رگڑا یا بلعم باعور نے سر مارا تو کیا ہوا؟ ہمارے سامنے بھی شیطان یا باعور کی صورت کیوں پیش نہ آئے گی؟''

فرمایا کہ :

یہ گمراہی کی باتیں ہیں، آخر تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ کسی سال کھیتی خشک ہوگئی تو کسان نے کھیت بونا چھوڑ دیا ہو؟''

مولانا نے پوچھا کہ کہا کہ بعض دفعہ دیکھا ہے کہ آدمی بیمار پڑ گیا۔یا لقمہ حلق میں اٹک گیا اور کھانے والا مر گیا۔پھر کیا لوگوں نے اس مثال سے متاثر ہو کر روٹی کھانا چھوڑ دی؟

ہمت دلاتے ہوئے مولانا فرمانے لگے کہ:

''دیکھو دنیا آفتاب و ماہتاب کی روشنی سے جگمگا رہی ہے۔تم خدا کے لیے کنویں کے مینڈک نہ بنے رہو اور یہ نہ کہو کہ ہمیں روشنی نظر نہیں آتی۔''

اور غصہ میں ارشاد ہوا کہ:

''ہرگز یہ نہ کہنا چاہیے کہ فلاں شخص نے کاشت کی تھی ان کی کھیتی خشک ہوگئی یا ٹڈیوں کا دل کھیت کو اس کے چاٹ گیا، ایسی صورت میں ہم کیوں کھیتی کریں؟ میرے ساتھ بھی کہیں یہی صورت پیش نہ آجائے۔''

فرمایا:

ہیں مکین استیزہ ورد کارکن   باتوکل ،کشت کن بہ شنو سخن

پھر دھمکاتے ہوئے کہنے لگے:

نادر مثالوں کو پیش کر کے کاروبار کو چھوڑنے والے درحقیقت قدرت سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ان کو سمجھنا چاہیے کہ ایسا کریں گے تو اٹھنا قیامت تک نصیب نہ ہوگا اوران نادر مثالوں کی پروا کیے بغیر جو کاشت میں مصروف رہے گا دیکھو گے کہ انبار خانے (اسٹور) کو غلے سے اس نے بھر دیا۔'' (دفتر سوم)

مسلمانوں کی بے دینی سے دین بیزاری پیدا ہوتی ہے:

۱۲ نومبر ۱۹۵۰ء: مولانا معنوی کی مجلس برکت وخیر میں حاضری میسر آئی۔مولانا اس قصے کا ذکر فرما رہے تھے کہ ایک بدآواز کریہہ الصوت مؤذن تھا،جس گاؤں میں اذان دیتا تھا وہاں کی آبادی اس کی آواز سے بے زار تھی۔بچے راتوں کو ڈر جاتے تھے،سوتے ہوئے لوگ نیند سے چونک پڑتے،شورش آبادی میں پھیلی ہوئی تھی۔آخر گاؤں والوں نے مشورہ کر کے چندے کے ذریعے کافی رقم جمع کی اور مؤذن صاحب کو حج پر آمادہ کرنے پر کامیاب ہوئے۔''زادِراہ'' مہیا کر دیا گیا۔مؤذن قافلے کے ساتھ روانہ ہوا،منزل بہ منزل گزرتا ہوا قافلہ ایک ایسے علاقے میں پہنچا جہاں صرف غیر مسلم اقوام کے لوگ آباد تھے۔مؤذن کو اذان دینے کا شوق تو تھا ہی،باوجود منع کرنے کے اس نے اذان پکار ہی دی۔لوگوں کو اندیشہ تھا کہ کوئی فتنہ نہ برپا ہو،غیر لوگ ہیں ان کی عورتیں اور بچے اگر ڈر گئے تو بدلہ لینے پر آمادہ ہوں گے مگر خلاف توقع دیکھتے کیا ہیں کہ ایک شخص ہاتھ میں ایک تحفہ اور ہدیہ سوغات کی چیزیں لیے چلا آ رہا ہے اور قافلے میں آ کر پوچھنے لگا کہ آپ کے قافلے میں مؤذن صاحب کون ہیں جنھوں نے آج آذان دی تھی؟ان کی خدمت میں اس حقیر نذرانے کو پیش کرنے حاضر ہوا ہوں۔لوگوں کو تعجب ہوا،بولے قصہ کیا ہوا؟اس غیر مسلم نے کہا کہ بھائی! ایک زمانے سے ہم لوگ مصیبت میں مبتلا تھے،ہماری ایک لڑکی جو حد سے زیادہ خوبصورت، خوب سیرت تھی،خدا جانے اس کے دل میں اسلام وایمان کا شوق کہاں سے پیدا ہوا،وہ اس دین کی ایسی گرویدہ ہوئی کہ لاکھ جتن کیے گئے مگر وہ اپنے خیال سے دست بردار ہونے

پر آمادہ نہ ہوتی تھی۔ آخر آج آپ کے مؤذن صاحب نے اذان دی تو اس مہیب دہشت ناک آواز کو سن کر لڑکی نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اذان ہو رہی ہے۔ سننے کے ساتھ لڑکی نے کہا اسلام کی اذان کیا گر یہ کیفیت ہے تو میں اس اسلام سے باز آئی۔ ہمارے گاؤں میں آج بڑی خوشی ہے، سارا گاؤں لڑکی کے اس حال پر بشاش ہے اور اسی لیے مؤذن صاحب کی خدمت میں اس کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔

قصہ ختم کر کے فرمانے لگے کہ جیسے مسلمانوں کے اس مؤذن سے لڑکی اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف واپس ہوگئی اسی طرح آج کل کے مسلمانوں کے اسلام سے لوگ بے زار ہو رہے ہیں۔ دین داروں کی بے دینی سے بے دینی پیدا ہو رہی ہے (واقعہ یہ ہے کہ کفر کی پیدائش عموماً دین کی اسی مجازی شکل سے ہوئی ہے۔ درحقیقت دین سے ہمیشہ دین ہی پیدا ہوا)۔

''جہانِ مردہ'' اور ''جہانِ زندہ'' کا تقابل:

مدت سے دونوں بزرگوں کی مجلسِ فیض سے غائب رہا۔ آج ۱۹۵۱ء کے پہلے ماہ جنوری کی پہلی تاریخ ہے۔ مولانا معنوی کا خیال آیا، حاضری کی اجازت مرحمت ہوئی۔ ارشاد ہو رہا تھا: دو مستقل عالم ہیں۔ ایک جہان مردہ ہے اور دوسرا جہان زندہ ہے۔ ان الدار الآخرۃ لھی الحیوان ۔ جہانِ زندہ کی ہر چیز زندہ ہے۔ موت سے کل اور جز دونوں پاک ہیں۔

فرمایا کہ:

''آدمی زندہ پر عاشق ہوتا ہے، زندہ معشوق سے زندگی جب نکل جاتی ہے تو مردہ لاش کو اپنی گود میں کون لیتا ہے۔''

فرمایا کہ:

یہی وجہ ہے کہ جو زندہ لوگ ہیں ان کا جی اس جہانِ مردہ میں نہیں لگتا۔ جانور گھاس کھا سکتے ہیں لیکن جو آدمی ہے اس کی خوراک گھاس کیسے بن سکتی ہے؟ بلبل کا دل پھول اور

چمنستان میں لگتا ہے۔ ہاں! گندے کیڑے کو گوبر میں آرام ملتا ہے۔"

فرمایا کہ:

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت جس نے نہیں دیکھی ہے اسے حجاج کی حکومت معیاری حکومت معلوم ہوتی ہے:

ہر کرا عدلِ عمر ننمود دست　　　پیش او حجاج خونی عادل ست

لڑکیاں جب زندوں کے کاروبار سے ناواقف ہوتی ہیں تو انھیں مردہ گڑیا کھیلنے کے لیے دی جاتی ہے یا بچے استعمال سے جب تک ناواقف ہوتے ہیں تو ان کو بجائے لوہے کے لکڑی کی تلوار کھیلنے کے لیے دی جاتی ہے۔

اس طرح انبیاء علیہم السلام کا صرف صوری نقش کافروں کے سامنے ہے، جو صرف آنکھوں کے اندر گھوم کر رہ جاتا ہے۔ مگر جن کے سامنے نقش کے پیچھے والا عالم ہے ان کو چند ٹیڑھی ترچھی لکیروں والے عالم کی پروانہیں ہے:

زاں جہاں ماراچوُدرروشنی ست　　　ہیچ ما پر دائے نقش و سایہ نیست

پھر مولانا نے فرمایا کہ:

"ایک شخص کا بیرونی نقش اس جہاں میں ہے اور دوسرا نقش اس کا چاند کی طرح آسمان پر ہے۔"

پھر باہر اور اندر یعنی ظاہر و باطن کے نقوش کے مسئلہ کو مختلف مثالوں سے سمجھاتے ہوئے فرمایا:

دستِ ظاہری کند دادوستد　　　دستِ باطن بردرِ فردِ صمد

آخری خلاصہ یہ نکلا کہ "ظاہری نقش" زمانے کے قید خانے میں بند ہے اور باطن زمانی حدود سے آزاد ہے:

ایں کہ دروقت ست باشد تا اجل　　　واں دگر ، یارابد قرن ازل

جس پر یہ حال طاری ہو جاتا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ:

خلوت و چلہ برولازم نماند　　ہیچ غرے مرورا عازم نماند

فرمایا کہ ''پانی میں ٹوکری کوکسی نے ڈالا، ٹوکری پانی سے بھر گئی اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوا کہ درحقیقت اس کے اندر پانی ہے، جب تک دریا میں رہی معلوم ہوتا تھا کہ پانی اس میں ہے لیکن جونہی دریا سے تعلق اس کا منقطع ہوا کچھ بھی اس میں باقی نہ رہا'':

آں سبد خود راچو پُراز آب دید　　کرد استغناو از دریا برید

درجگر چوں قطرۂ آبش نماند　　بحر رحمت کرد داوراباز خواند

(دفتر پنجم)

حفاظتِ توبہ کی تاکید:

بہت دن کے بعد مولانا معنوی کا خیال آیا، حاضری آسان کی گئی، فرمارہے تھے قصہ اس شکاری کا جو جنگل میں گھاس سبزہ پھول کی ٹولی بنا کر کنارے پڑا ہوا تھا اور دام کو بچھا کر گیہوں کے چند دانے وہاں ڈال دیے تھے، ایک چڑیا اس طرف سے گزر رہی تھی، اس حال میں شکاری کو دیکھ کر بولی جناب: آپ نے یہ جنگل کی زندگی کیوں اختیار کی؟ شکاری بولا کہ موت سامنے ہے۔ مرنے سے پہلے موت کی تیاری کر رہا ہوں۔ میرا ساتھی مرگِ ناگہانی میرے لیے واعظ بن گیا، سب کچھ چھوڑ کر میں نے جنگل کی زندگی اختیار کی۔ میری روح آب وگل کے قالب میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اندر سے آواز آئی کہ میاں تم ہمیں بھول گئے تمھاری حالت تو اس بچہ کی سی ہے جو کبڈی کھیلنے کے لیے کپڑے اتار کر کھیل میں مشغول ہو۔ کسی نے کپڑے اور جوتیاں اس کی اٹھالیں، بچہ کھیل میں اس طرح مستغرق تھا کہ نہ کپڑے یاد رہے نہ جوتیاں، جب رات آئی تب تلاش ہوئی۔ اب کیا کرے گھر جانے سے شرماتا تھا۔

مولانا نے فرمایا کہ:

''یہی وقت ہوتا ہے کہ چور کا آدمی پیچھا سواری پر بیٹھ کر کرے۔ سواری؟ سمجھا بھی کیا

ہے،اس کا نام توبہ ہے۔عجیب سواری'':

مرکب توبہ عجائب مرکب ست بر فلک تازد بیک لحظہ زپست

مگر آدمی کو چاہیے کہ اس کی حفاظت کرے ورنہ کہیں وہ قصہ نہ پیش آئے کہ ایک غریب آدمی کے گھر سے ''قچ'' چور لے بھاگا۔قچ والے نے پیچھا کیا۔کنویں کی مینڈھ پر چور بیٹھ کر شور و ہنگامہ کرنے لگا۔قچ والے نے کہا کہ کیا ہوا کیوں روتا ہے؟ بولا اسی کنویں میں میری تھیلی پانچ سو درہم کی گرگئی،کوئی نکال دے تو سو درہم یعنی پانچواں حصہ اس کو دوں گا۔قچ والے نے کپڑے اتارے اور کنویں میں کود پڑا۔ادھر وہ کنویں میں اترا اور چور اس کے کپڑے لے کر چمپت ہوگیا۔گئے تھے کہ قچ چور سے چھینیں گے اور رکھوادیا اپنا سب کچھ۔اس طرح شیطان ''توبہ'' کی سواری سے بھی آدمی کو محروم کردیتا ہے،اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

بہ ہر حال شکاری نے جب ترک دنیا کی ڈینگ ماری تو چڑیا نے کہا کہ تم مسلمان ہو، اسلام میں کہاں رہبانیت جائز ہے۔اس موقع پر مولانا نے فرمایا کہ:

مصلحت دَر دینِ عیسٰی غار و کوہ مصلحت در دیں با جنگ و شکوہ

شکاری نے کہا یہ حکم تو قوت والوں کے لیے ہے۔ہم کمزوروں کے لیے تو پرہیز ہی بہتر ہے۔ (دفتر ششم)

صرف اللہ ہی سے مانگو:

بعد مغرب مولانا سے استفادہ کی گدگدی پیدا ہوئی۔فرمانے لگے:

معنی اللہ گفت آں سیبویہ یولھون فی الحوائج ھم لدیہ

صد ہزاراں عاقل اندر وقت درد جملہ نالاں پیش آں دیان فرد

گر ندیذ ندے ہزاراں بار پیش عاقلاں جاں کیے کہیشد ندش بہ پیش

ہیں از دخواہیدہ نے از غیر اُو آب دریم جوہا مجو در خشک جو

در نہ خواہی از دگرہم او دہد — برکف میش سخا ہم او نہد

آں کہ معرض رازِ رقاروں کند — روبدو آری بہ طاعت چوں کند

اللہ کے معنی سیبویہ نے لکھا ہے کہ یہ ہیں، ضرورتوں میں بے تابانہ جس کی طرف توجہ کی جائے۔

فرمایا کہ:

''بڑے بڑے دانا اور خردمند عقل کے پتلوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب درد ان کو پکڑتا ہے تو ساری عقل دھری رہ جاتی ہے، اور اسی دینے والے کو پکارتے ہیں۔ اگر تجربہ نہ ہوتا کہ فریاد رسی فرماتا ہے تو لوگ اس کی طرف کیوں دوڑتے؟ بھائی! پانی دریا سے چاہو، خشک ندی بے چاری کیا دے گی۔ پس اللہ ہی سے مانگو، اس کے سوا اور کون ہے جو دے گا؟ غیر سے بھی ملتا ہے تو دینے والا وہی ہے، وہی سخاوت کے جذبے کو حرکت میں لاتا ہے۔ قارون جیسے نافرمان کو جو سونا دے، فرماں برداروں کو وہی کیا نہ دے گا۔''؟

(دفتر چہارم)

''شر'' اور ''خلق شر'':

۲۷ جنوری ۱۹۵۱ء کے دن مولانا رومیؒ سے شرف نیاز حاصل ہوا، فرمانے لگے کہ ایک شخص پوچھنے لگا کہ کفر کے ساتھ راضی ہونا بھی کفر ہے اور کفر چونکہ حق تعالیٰ کے قضاء کا نتیجہ ہے اس لیے قضائے الٰہی کے ساتھ راضی رہنا یہ ایمان ہے۔ ایمان و کفر کو کیسے جمع کروں؟ مولانا نے اس شخص سے کہا کہ بھائی! تم نے قضاء اور مقضی کے فرق کو نہیں سمجھا۔ ایک خطاط اچھے حروف بھی لکھتا ہے اور انھی حروف کو بگاڑ کر بھی لکھتا ہے، ایسی صورت میں برائی اور بھلائی کے مرجع حروف ہیں نہ کہ خطاط کا کمال ہے۔ بلکہ:

قوت نقاش باشد آں کہ او — ہم تواند زشت کردن ہم نکو

اور یہ کہ:

زشتیِ خط زشتیِ نقاش نیست — بلکہ از وے زشت را بہ نمود نیست

یعنی برے حروف کی برائی کو نقاش اس ذریعے سے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ پس حروف کی خرابی سے حروف کی خرابی ظاہر ہوئی نہ کہ لکھنے والے کی بُرائی۔

اس موقع پر مولانا نے یہ فرماتے ہوئے کہ شر اور خلق شر کے فلسفے کو زیادہ بڑھاتا ہوں، تو خواہ مخواہ میرا وقت ضائع ہوتا ہے، تسلی حاصل کرنے والوں کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی سمجھا۔ (دفتر سوم)

دماغی نکتہ آرائیاں قلب کی غفلت کی نشانی ہیں:

اور اسی کے بعد بڑے پتے کی بات حضرت والا نے یہ ارشاد فرمائی کہ بھائی یہ فلسفہ، یہ نکتہ نوازیاں ان ہی دماغوں میں عموماً آتی ہیں، جن کا دل درد سے خالی ہے اور دین کی فکر سے جو غافل ہیں۔ پھر ایک لطیفے کا ذکر فرمایا کہ ایک بڈھے نے جوان عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد اصلاح ساز کی دکان پر پہنچ کر اس نے درخواست کی کہ میری داڑھی کے سفید بالوں کو نکال دو۔ اصلاح ساز جسے غالباً مولانا کے زمانے میں ''آئینہ دار'' کہتے تھے اس نے بڈھے کی ساری داڑھی مونڈ ڈالی اور داڑھی کے بال بڈھے کے سامنے رکھ کر بولا کہ سفید بالوں کو سیاہ بالوں سے اب آپ خود ہی جدا کر لیجیے، مجھے تو ایک کام ہے اتنی فرصت نہیں کہ آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں۔

اِسی سلسلے میں ایک دوسرا لطیفہ بھی مولانا کو یاد آ گیا۔ ایک شخص نے کسی غریب کے سر پر چپت رسید کی، چپت کھانے والا بھنا گیا اور چاہتا تھا کہ مارنے والے سے بدلہ لے۔ چپت لگانے والے نے کہا کہ بھائی! ذرا ٹھہرو۔ پہلے میرے ایک سوال کا جوب دے دو، پھر جو چاہنا کرنا اور وہ سوال یہ ہے کہ سر پر آپ کے جس وقت میں نے چپت رسید کی تو تڑاق کی آواز اس سے پیدا ہوئی، اب آپ فرمایئے کہ یہ آواز کس سے پیدا ہوئی؟ آپ کی چندیا سے پیدا ہوئی یا میرے ہاتھ سے پیدا ہوئی؟ لیکن چپت کھانے والے نے کہا کہ خوب! میرا حال

تو درد سے تباہ ہو رہا ہے اور میں تکلیف سے بے کل ہوں اور آپ مجھ سے فلسفہ دریافت فرما رہے ہیں کہ آواز ہاتھ سے پیدا ہوئی یا چندیا سے۔ آخر میں چپت کھانے والا جو کہ درد سے بے چین تھا بولا کہ:

تو کہ بے دردی ہمیں اندیش ایں　　　　نیست صاحب درد را ایں فکر بیں؟

اسی کے بعد مولانا نے فرمایا:

غفلت و بے دردیت فکر آورد　　　　درخیالت نکتہ بکر آورد

حاصل جس کا وہی ہوا کہ نت نئے نکتے اور "نکتہ بکر" یہ پیٹ بھروں کی باتیں ہیں، بال کی کھال نکالتے ہیں۔ لیکن دین کے درد میں جو تڑپ رہا ہے اسے ان باتوں کی کہاں فرصت ہے اس کا کام تو فقط اس قدر ہے:

حکم حق را بر سر و رومی نہد　　　　حفظ فکر خویش یک سومی نہد

درد والے صرف خدا کی باتوں پر کان لگاتے ہیں اور اپنی زندگی کو ان ہی کے مطابق بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔　　　　(دفتر سوم)

مثنوی کا ایک ظاہر ہے اور اس کے تحت اس کا باطن بھی ہے:

۲ مارچ ۱۹۵۱ء: حضرت معنوی کی مجلس فیض و برکت تک دل سے پہنچایا، اپنی قسمت پر نازاں ہوں کہ ان تاریک دنوں میں ایک کوردہ گاؤں کے اندر اس روشن و پاک مجلس تک رسائی میرے لیے آسان کی گئی۔ آج مثنوی کے نکتہ چینوں کی طرف سے گونہ گرانی پائی جارہی تھی، اس کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ ایک دلچسپ "خریط" استعمال فرمایا۔ بڑی بط کو خریط کہتے ہیں اور پھر مسخروں کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ فرما رہے تھے کہ سنا! ایک گدھے خانے سے کسی "مسخرے" نے سر نکالا اور کہنے لگا کہ مولوی رومی کی مثنوی کا آخر لوگوں میں اتنا چرچا کیوں ہے؟ مجھ تو اس مثنوی میں اس کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا کہ بار بار مولوی

صاحب دوہرا دوہرا کر یہی کہتے ہیں کہ "پیغمبر کی پیروی اور اتباع ہی نجات کی راہ ہے"، یعنی خریط کہہ رہا تھا:

کہ ایں سخن کیست ست یعنی مثنوی قصہ پیغمبر است و پیروی

خریط یہ بھی کہتا تھا کہ تصوف میں کوئی کتاب مولوی صاحب اگر لکھنا چاہتے ہیں تو اس میں چاہیے تھا کہ صوفیہ کی گہری باتوں کو بیان کرتے۔ ان کے بلند اسرار،، عمیق رموز کی عقدہ کشائی کرتے، کچھ فنا و بقا کی تشریح کرنی چاہیے تھی۔ بتاتے کہ تبتل کی راہ اختیار کر کے چلنے والے کس طرح ترقی کرتے ہوئے:

"پایہ پایہ تا ملاقاتِ خدا"

پہنچتے ہیں بجائے اس کے اس مثنوی میں ان قصوں اور کہانیوں کے سوا جن سے بچے خوش ہوں مجھے تو اور کوئی چیز نہیں ملتی۔ الغرض ساری مثنوی خریط کہتا تھا کہ:

جملہ سرتا سر فسانہ است وفسوں کود کانہ قصہ بیرون ودروں

خریط کی اس جاہلانہ تنقید نے مولانا میں جوش کی کیفیت پیدا کر دی، جلال میں بھرے ہوئے تھے، فرما رہے تھے کہ بھائی! میری مثنوی کے متعلق خریط نے اگر یہ رائے قائم کی تو کیا ہوا؟ بداندیشوں نے تو اللہ کی کتاب کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا۔ خود قرآن ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ" اساطیر الاولین " اگلوں کی کہانیاں، کہنے والے بھی دنیا میں اس کتاب عزیز کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ وہی یہ بھی کہا کرتے تھے کہ نہ قرآن میں فلسفہ ہے اور نہ حکمت و تحقیق ہے اور نہ عالمانہ نکات و دقائق اس کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ لے دے کر تو کچھ ایسی باتیں ملتی ہیں کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ اللہ میاں اس فعل کو پسند کرتے ہیں فلاں فعل ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ آدم و ابلیس کے قصے ہیں۔ کچھ ہود و عاد والی آندھی، ابراہیم علیہ السلام کی آگ، نوح علیہ السلام کی کشتی، اس زمانے کا طوفان یا یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام، زلیخا کی داستان، اسماعیل علیہ السلام کی قربانی

،جبرائیل علیہ السلام کا نام ،کعبہ اور ہاتھیوں کے حملے کا ذکر ،بلقیس اور سلیمان علیہ السلام ،سبا کے افسانے ۔۔۔۔۔۔۔الغرض اسی طرح کچھ حضرت داؤد ،طالوت شعیب ،یونس علیہم السلام کی سرگزشتیں ۔حضرت مریم کس طرح حاملہ ہوئیں ،ولادت کے بعد کھجور کے درخت کو ہلا کر پھل گرانے کا حکم ان کو دیا گیا یا یہ کہ یحییٰ علیہ السلام زکریا علیہ السلام کی دعا سے پیدا ہوئے ،صالح علیہ السلام نے پتھر سے اونٹنی نکالی ،اونٹنی کی وجہ سے پانی کی تقسیم کا جھگڑا پیش آیا ،ادریس علیہ السلام ،الیاس علیہ السلام ،عزیر علیہ السلام کے نام ،قارون زمین میں کس طرح سے دھنسایا گیا ،بنی اسرائیل وادی تہیہ میں چالیس سال کس طرح بھٹکتے رہے ۔موسیٰ علیہ السلام کو درخت میں آگ نظر آئی ۔ان کی لاٹھی اژدھا بن کر لہرانے لگی ۔عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے ،خضر علیہ السلام کے قصے اور کچھ رسول علیہ السلام کی تعریف ،ان کے چند معجزات ، جنت والے کہتے تھے ان ہی چند سیدھی سادی باتوں کے سوا قرآن میں اور دھرا ہی کیا ہے۔

مولانا پھر اسی خریط کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جب قرآن کے متعلق کافروں کی جانب سے یہ لطیفے پھیلائے جا رہے تھے تو قرآن نے اعلان کیا تھا کہ اگر اتنی ہی سادی اور سیدھی باتوں پر قرآن مشتمل ہے تو پوری کتاب کا نہ سہی اس کی ایک سورۃ یا ایک آیت ہی کا جواب بنا کر پیش کرو ۔قرآن ہی نے یہ بھی کہہ دیا کہ انس و جن مل کر بھی اس کی کوشش کریں گے تو اس میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

(پیرخاں) مولانا بھی شاید یہی فرمانا چاہتے تھے کہ میری مثنوی بھی اگر واقعی جیسا تم کہتے ہو کوئی ہلکی پھلکی کتاب ہے تو کیوں لکھنے والے اسی قسم کی مثنوی لکھ کر اپنے آپ کو اور اپنی کتاب کو دنیا میں مقبول بنانے میں کامیاب نہیں ہوں گے ۔مگر یہ میرا اضافہ ہے مولانا نے یہ نہیں فرمایا۔ (مناظر احسن گیلانی)

مولانا کو یہ موقع مل گیا قرآن پر بحث کرنے کا اور خریط کو اسی خبط کے حوالے کر کے فرمانے لگے کہ قرآن کا ایک تو ظاہر ہے ۔اس ظاہری پہلو کے نیچے باطنی پہلو بھی اس کتاب

کی آیتوں کے ہیں، باطن میں بھی چند طبقات ہیں، باطنی پہلو کی ایک تہہ تک پہنچنے کے بعد جب دوسری باطنی تہہ سوچنے والوں کے سامنے آتی ہے تو وہ ششدر و حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یوں ہی تہہ کے بعد تہوں کا سلسلہ ملتا ہی چلا جاتا ہے۔ تیسری تہہ تک پہنچنے کے ساتھ ہی آدمی کی عقل گم ہو جاتی ہے۔ آگے تو ایک حد ایسی بھی آتی ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔

فرماتے ہیں کہ بھائی! لوگ آدمی کے قالب کو دیکھ کر تو وہی رائے قائم کر سکتے ہیں جو ابلیس نے کی تھی کہ مٹی اور پانی سے مل جو کیچڑ تیار ہوئی تھی اس کیچڑ میں زندگی پیدا ہو گئی۔ ورنہ ''اصل اس کی کیچڑ ہے''۔ یہ ایک شیطانی مغالطہ ہے۔ کہنے لگے میاں! اولیاءاللہ مشہور ہے کہ وہ پہاڑوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں، لیکن سچ پوچھو تو آبادی میں بھی جس وقت وہ رہتے ہیں اس وقت بھی عوام کے لحاظ سے وہ پہاڑوں کے غاروں ہی میں چھپے رہتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندی پر بھی جو قیام فرما ہیں کیا ان کی حقیقی بلندی یہی ہے؟ تمھارے سامنے وہ پہاڑ پر نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ساتوں آسمانوں سے بھی وہ اونچے ہیں۔ بہ ہر حال جن لوگوں کو آسمان بھی نہ چھو سکتا ہو ان کو ضرورت ہی کیا ہے کہ وہ پہاڑوں پر جا کر اپنے آپ کو مخلوق کی نظروں سے چھپائیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جن، بھوت، پری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ واقعی انسان کی جو اصل حقیقت ہے وہ دیو اور پری سے بھی زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی جو اژدھا بن جاتی تھی اژدھا بننے کے وقت ایک سانپ کی صورت میں وہ نظر آتی تھی مگر درحقیقت یہ اژدھا ایسا تھا کہ کائنات کو اپنے اندر اگر چاہتا تو ہڑپ کر لیتا:

ظاہرش چوبے ولیکن پیش او   کون یک لقمہ، چو بہ کشاید گلو

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان مبارک سے کچھ حروف اور الفاظ نکلے تھے لیکن یہ ایسے حروف اور الفاظ تھے جن سے زندگی مردوں کے بدن میں واپس آ جاتی تھی کہ مسیح علیہ

السلام کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو نہ دیکھے۔ نظر اس پر رکھے کہ مردہ جو پڑا ہوا تھا کلبلا کر اٹھ بیٹھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو کیا دیکھتے ہو اس کو دیکھو کہ سمندر کو پھاڑ کر اس نے رکھ دیا مولانا پھر جوش میں آ گئے اور فرمانے لگے میاں گرد کو کیا دیکھتے ہو اس سوار کو دیکھو جو اس گرد میں چھپا ہوا ہے۔ (دفتر سوم)

تنہا عقل محافظ حدود نہیں ہو سکتی!:

۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کو حضرت معنوی کی مجلس انس وافادہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت قصے کے رنگ میں تقریر اس مسئلے پر فرما رہے تھے کہ:

''اس قسم کا دعویٰ ہر عام آدمی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ عقل تو بے شک لوگوں میں ہوتی ہے لیکن عقل سے کام لینے کے لیے جس عزم اور ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس سے عموماً لوگ محروم ہوتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ ایک صاحب تھے جن کی لڑکی جوان ہوگئی، فکر شادی کی ہوئی، کفو اور خاندان میں مناسب بر نہیں ملا مجبوراً غیر خاندان کے لڑکے سے لڑکی کا عقد کر دیا۔ مگر اسی کے ساتھ لڑکی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ کرنے کو تیرا عقد گو میں نے اس مرد سے کر دیا لیکن خاندان کا آدمی نہیں ہے اور اس کا بھروسا نہیں کہ نباہنے کی کوشش کرے گا۔ ایسی صورت میں مناسب یہی ہے کہ کوئی اولاد اس سے پیدا نہ ہو۔ ممکن ہے کہ اولاد پیدا کر کے خود رفو چکر ہو جائے اور بچے کو تیرے گلے کا طوق بنا کر مصیبت میں مبتلا کر دے۔ مولانا کے اصل اشعار یہ ہیں:

گفت دختر را کزیں داماد نو   خویش را پرہیز کن حامل مشو

کز ضرورت بود عقد ایں گدا   ایں غریب خوار ابنود وفا

ناگہاں بجہد کند ترک ہمہ   بر تو طفل او بماند مظلمہ

لڑکی باپ کی نصیحت کو سنتی اور عرض کرتی کہ میں ایسا ہی کروں گی۔ ہر دوسرے تیسرے دن باپ نے دستور تھا کہ لڑکی کو یاد دلاتا اور مزید تاکید کرتا۔

مگر خلوت میں میاں بیوی جمع ہونے لگے تو باپ کی نصیحت بے کار ثابت ہوئی۔ لڑکی حاملہ ہوگئی، باپ نے پوچھا کہ یہ کیا کیا؟ لڑکی نے کہا کہ ابا جان روئی آگ کے سامنے لائی جائے گی تو جلنے سے کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟ اور یہاں واقعہ یہ ہے کہ:

''آتش وپنبہ ست بیشک مرد وزن''

اس زمانے میں بھی ''مخلوط سوسائٹی'' کے علم برداروں کی طرف سے یہی نظریہ قائم کیا جاتا ہے کہ عقل کے زور سے حدود کی حفاظت میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن وقت پر عموماً تجربہ اسی کا ہوا کہ عقل کے استعمال کا صحیح موقع نہ ملا اور روئی میں آگ لگ گئی۔

(دفتر پنجم)

ہم جنسی میں عجیب جاذبیت ہے:

۸ جولائی ۱۹۵۱ء ہے اور آج دو تاریخ عید کی ہے، ظہر کی نماز کے بعد حضرت معنوی کی محفل قدس کا خیال آیا۔ مجلس جمی تھی صفِ نعال میں شریک ہوگیا، فرما رہے تھے:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں ایک عورت ہانپتی ہوئی حاضر ہوئی، عرض کرنے لگی حضرت میرا بچہ چھت کی نالی کے پاس ایسی جگہ جا کر بیٹھ گیا ہے کہ کسی کی رسائی اس تک نہیں ہوسکتی اور بلاتی ہوں تو اندیشہ ہے کہ خوف سے وہ گر نہ پڑے، کوئی صورت نجات کی سمجھ میں نہیں آتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ تدبیر اس کی یہ ہے کہ اگر اس بچے کا ہم جولی لڑکا ہو تو اس کو سامنے لے آؤ۔ اپنے ہم عمر ہم جولی کو دیکھ کر تمھارا بچہ خود بخود اس کے پاس آجائے گا۔ عورت نے یہی کیا، تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ بچہ اپنے ہم جولی کو دیکھ کر خوشی سے اس کے پاس آگیا، یہ تھا تو قصہ۔۔۔۔۔۔اب مولانا قصہ کے نتائج کی طرف متوجہ ہوئے، یاد دلایا کہ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ بشر کی صورت میں وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں؟ یہی ہم جنسی کا راز ہے:

''زاں کہ جنسیت عجائب جاذبی ست''

اسی کے ساتھ ارشاد ہوا کہ جہاں کہیں تم کو طالب نظر آئے سمجھو کہ وہ اپنے ہم جنس ہی کا طالب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام اسی لیے تو اُوپر بلا لیے گئے کہ ملکوتی الصفات ہو چکے تھے۔ عالم ملکوت کی طرف کھنچ گئے اور جیسے وہ بلندی کی طرف گئے جن لوگوں کو شیطانی صفات سے مناسبت تھی وہ شیطان کی طرف جھک گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ

شیطان کی طرف انسان کیوں جھکتا ہے؟:

سب سے پہلی علامت اس بات کی کہ شیطان کی طرف آدمی جھک گیا، یہ ہے کہ شیطان کی پہلی برائی یعنی حسد کا شکار ہو جائے۔ یہ پہلا مرض ہے جس کا شیطان میں ظہور ہوا۔ فرمایا کہ حاسد غریب کا عجب حال ہوتا ہے:

ہر کرا دید او کمال از چپ و راست از حسد قولنجش آمد، درد خواست

الغرض کمال ظہور کسی میں ہونا شرط ہے اور حاسد غریب پر قولنج کے دورے پڑنے لگتے ہیں، درد سے تڑپتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ

زاں کہ ہر بدبخت خرمن سوختہ می نخواہد شمع کس افروختہ

اپنی کھلیان میں آگ لگا کر چاہتا ہے کہ کسی کے گھر میں دیا روشن نہ ہو۔ (دفتر چہارم)

علاجِ حسد:

مولانا نے فرمایا کہ حسد کے مرض سے نجات پانے کی ایک ہی ہے راہ ہے کہ آدمی خود اپنے اندر کسی کمال کو پیدا کرلے۔ جب خود صاحب کمال ہوگا تو دوسروں کے کمال کو دیکھ کر نہ جلے گا۔ جلتے وہی ہیں جو خود کمال سے خالی ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جیسے خود مفلس ہیں دوسرے بھی مفلس ہو جائیں۔ (اور سارے کمالات میں بڑا کمال یہ ہے) کہ آدمی کسی باطنی شغل میں مصروف ہو جائے۔ ایک گھونٹ بھی اس شراب کی جسے میسر آجاتی ہے تو اسی میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ پھر خبر نہیں ہوتی کہ سارے جہاں میں کیا ہو رہا ہے۔ ارشاد ہوا کہ مٹھی بھر بھنگ میں

خاصیت ہے کہ پینے والے کو زندہ جہاں سے تھوڑی دیر کے لیے غافل بنا دے۔ پھر باطن والی شراب کی خاصیت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ نیند ہی کو دیکھو! طاری ہوئی اور دونوں جہاں سے انسان بے خبر ہو گیا۔ تم نے سنا ہوگا کہ غریب مجنون کھال کے عشق میں ایسا دیوانہ ہوا کہ سارے دوست کی تمیز جاتی رہی۔

الغرض قدرت نے انسان کے اندر احساسات پیدا کیے، ان احساسات کے لیے ایسی دوائیں قدرت نے مقرر کر رکھی ہیں جن میں ان کا مداوا ہے۔ مگر مستی پیدا کرنے والی اس شراب کے استعمال سے پہلے ضرورت ہے کہ استعمال کرنے والا دیکھے کہ اس کی یہ مستی استعمال کرنے والے کو کدھر لے جاتی ہے۔ ایک شراب وہ بھی ہے کہ پینے والا نفس کی خواہشوں میں غرق ہو کر سب کچھ بھول جاتا ہے اور شراب ہی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو عقل کو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف کھینچ کر پہنچاتی ہے۔ حوصلہ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ آسمانوں کے خیموں کو پھاڑ کر آگے کی راہ آدمی کے سامنے لے آتا ہے۔

پس صرف ۔۔۔۔ ''مستی'' مطلوب نہیں ہے بلکہ مست آدمی کس میں ہوا ہے، دیکھنے کی بات صرف یہ ہے۔ آخر گدھا بھی تو مست ہوتا ہے لیکن کس چیز کا مست؟ جو کی چند مٹھیوں کا اور مسیح علیہ السلام بھی مست تھے لیکن کس کے؟ حق کے۔

بہر حال:

بیں بہر مستی ولاغر ۃ مشو   ہست عیسیٰ حق خرمت جو

شراب خم خانوں میں بھری ہوئی ہے احتیاط شرط ہے۔ کس خم کی شراب پی رہے ہو پہلے چکھ کر اندازہ کر لو، تم کو مست کرنے والی شراب ان ہی خم خانوں میں ایسی بھی مل جائے گی کہ: ''مستیت آرد، کشاں تا رب دیں''

دین والے رب کی مستی جس سے پیدا ہو اسی شراب کو تلاش کرو:

تا رہی از فکر دو سواس وحیل   بے عقال عقل در رقص الجمل

یعنی یہی وہ مستی ہے جو آدمی کو اس مہلک مرض سے شفا بخشتی ہے جس کا نام ''وسواس'' ہے اور جیسے اونٹ ناچنے لگتا ہے، اس شراب کا مست عقل کے بیکوڑے (عقال) سے نکل کر محو رقص ہو جاتا ہے۔

انبیاء کی طرف کون جھکتے ہیں؟:

اس ناسوتی عالم میں حضرات انبیا علیہم السلام بشری صورت، ملکی سیرت کے ساتھ پیدا کیے جاتے ہیں، ان کے دامن کو وہی تھامتے ہیں جو ان سے مناسبت رکھتے ہیں۔ آگ اور ہوا دونوں کا قدرتی میلان بلندی کی طرف ہے۔ جب ان کو اپنے حال پر چھوڑا جائے اوپر ہی جانا چاہیں گے۔ خالی گھڑے کو جس میں ہوا بھری ہو تم دریا میں الٹ کر رکھ دو یا سمندر میں لیکن کبھی وہ پانی کے اندر نہ جائے گا۔ اوپر ہی تیرتا رہے گا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ :

کہ دلش خالی ست در دے باد ہست

پس

میل بادش چوں سوئے بالا بود ظرف خود را ہم سوئے بالا کشد

آدمی میں عقل بھی ہے اور نفس بھی۔ عقل جس پر غالب ہے وہ پیغمبروں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور نفس جس پر مستولی ہے وہ شیطان کی طرف گھسٹتا ہے۔

قُربِ حق کی دو قسمیں:

حضرت معنوی کی مجلس معنوی و حقیقت کا ولولہ موجزن ہوا، حضوری کی سعادت کے ساتھ فوائد یہ حاصل ہوئے۔ فرمار ہے تھے قصہ اس گیدڑ کا جو رنگ ریز کے ٹب میں غوطہ لگا کر نکل آیا تھا جس کی وجہ سے طرح طرح کے رنگ سے گیدڑ کی کھال رنگین ہوگئی۔ باہر نکلنے کے بعد گیدڑ کو اپنے رنگ کے متعلق غلط فہمی ہوئی۔ خیال کرنے لگا کہ ایک قسم کا طاؤسی جسم قدرت کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔ اب معمولی صحرائی گیدڑوں کی مانند میں باقی نہ رہا۔

میں اور کچھ ہو گیا ہوں۔ دوسرے گیدڑوں سے کنارہ کنا رہ یہ گیدڑ رہنے لگا۔ ایک گیدڑ پہنچا اور بولا بھائی! آپ ہیں کس حال میں؟ آپ کو کیا ہوا کہ ہم لوگوں سے کچھ الگ الگ رہنے لگے۔ اس نے کہا کہ تم نے یہ کیا مکر وفریب کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ تمھاری حالت تو اس شخص کی معلوم ہوتی ہے جس کو دنبے کی کھال مل گئی تھی۔ کھال میں کچھ چربی لگی تھی جب گھر سے نکلتا تو موچھ پر تھوڑی سی چربی مل لیتا اور دوستوں میں بیٹھ کر مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے باور کراتا کہ گھر میں بہترین بریانی اڑا کر آ رہا ہے۔ لیکن اس کا پیٹ اندر سے کوستا کہ خدا تیری مونچھ کو اکھاڑے۔ بندۂ خدا اگر تو لوگوں کو یہ باور نہ کراتا پھرتا کہ میں نے آج یہ کھایا ہے، وہ کھایا ہے تو شاید تیرے حال پر رحم کر کھا کر کوئی کچھ کھلا ہی دیتا یا کوئی دوست دعوت کر دیتا۔ کم از کم اپنا واقعی حال لوگوں پر نہ کھولتا تو یہی کرتا کہ چپ رہتا۔ لیکن اب سُن کہ چمڑا دنبے کا جس میں چربی لگی ہوئی تھی اسے بھی بلی لے بھاگی۔ اب اپنی مونچھ میں تو کیا لگائے گا؟

اس بارے میں مولانا فرما رہے تھے کہ ''قربِ حق'' کی دو مستقل قسمیں ہیں۔ خلق اور رزق کا قرب تو ایسا قرب ہے جس میں ہر خاص عام کی حیثیت برابر ہے۔ اور قرب حق کی دوسری قسم کا نام ''قرب وحی و عشق'' ہے۔ یہی قسم قرب کی اولیاء اور انبیاء سے مختص ہے۔

فرمایا کہ آفتاب کے ساتھ سوکھی شاخ کو بھی قرب کی نسبت حاصل ہوتی ہے اور شاخِ تر کو بھی۔ لیکن شاخِ تر آفتاب کی روشنی سے شیریں اور مزیدار میووں کو پیدا کرتی ہے اور خشک شاخ کی خشکی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

''الم نشرح'' کی توضیح:

۱۷ اگست ۱۹۵۱ء: عجیب بات ہے آج کل سورۃ الم نشرح کے متعلق خیال دل میں گزر رہا تھا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ العسر (دشواری) کے ساتھ یسر کو اطلاقی رنگ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ پیدا کیا گیا کہ کسی متعین دشواری کے ساتھ یســـــــر اور آسانیوں کی

متعدد شکلیں پیدا ہوتی ہیں:

اذا شتدت بک البلوی ففکر فی الم نشرح
فعسرٌ بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

والا شعر مدرسوں میں عام طلبا کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔لیکن نیا خیال یہ ذہن میں آیا کہ اس سے پہلے رسول ﷺ کو خطاب کر کے یاد دلایا گیا ہے کہ بند سینے کو آپؐ کے ہم نے کھول دیا۔یعنی علوم کے دروازے وحی کے ذریعے آپؐ پر کھل گئے۔پھر آپ کو تنہا اس دنیا میں کھڑا کر دیا گیا جو کفر و شرک سے بھری ہوئی تھی۔کتنا بڑا بوجھ تھا جو آپؐ پر لادا گیا اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ اپنے گھر تک کے لوگ حتیٰ کہ حقیقی چچا ابولہب جیسے تک دشمن ہو گئے۔وطن کو چھوڑنا پڑا بڑا بوجھ تھا جس نے کمر ہی توڑ دی۔مگر بوجھ جس نے لادا تھا اس نے اتار بھی دیا۔دس لاکھ مربع میل کی عرب کی زمین آپ کے حیطۂ اقتدار میں آ گئی،کامیابی کیسی کامیابی ''اتار دیا'' اس نے اس بوجھ کو جس نے توڑ دی پیٹھ تیری'' اور بے مادر و پدر،امّی ﷺ کے ذکر کو اتنی رفعت بخشی گئی کہ نسلِ انسانی میں اس کہ نظیر نہیں ملتی۔کون نشاندہی کر سکتا ہے کسی ایسے آدم زاد کے نام کی جس کا نام چوبیس گھنٹوں کے اندر تیرہ سو سال سے ایشیاء کے ہر ملک عرب،شام،سندھ و ہند،مصر،جزائر ہند،شرقی و غربی چین میں بھی لیا جاتا ہے اور افریقہ کے بھی اکثر حصوں میں اور یورپ کے بھی بہت سے علاقوں میں،اولاً تو ایسی شخصیت ہی نہیں ملتی جس کی شہرت کا دائرہ اتنے وسیع ممالک کو محیط ہو اور پنج وقتہ اذان میں رفع ذکر کی یہ صورت کسی کے لیے اختیار ہی نہیں کی گئی۔

الغرض عدم کے بعد شرح صدر،پشت شکن بار کے بعد اس بار کو کامیابی کے ساتھ اتارنا چاہیے تھا جس سے زیادہ گم نام کوئی نہ ہوتا اسی کو ساری نسل میں رفع ذکر کی ایسی نعمت بخشی کہ جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔

ان واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ اگر کیا جائے کہ ہر ''دشواری'' اسی لیے آتی ہے

تا کہ یسر اور آسانی کی لذت آدمی کو محسوس ہو۔ بند آنکھ والے ہی کھلی آنکھ کی لذت کو، بوجھ سے جو دبایا جا رہا ہے وہی بوجھ اترنے کی مسرت کو اور گمنام ہی نام آوری کی شہرت کی قدر و قیمت کو پہچان سکتا ہے۔

یہی خیال دماغ میں چکر کھا رہا تھا کہ دل کو سمجھاتا تھا کہ ''دشواری'' جب آئے تو یہ سمجھو کہ ''یسر'' اور آسانی کی لذت سے قدرت تم کو سرفراز کرنے والی ہے۔

آج مجلس معنوی میں حاضری ہوئی تو ہمیشہ کی طرح اسی خیال کا اعادہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

رنج و غم راحق پے آں آفرید تابدیں ضد خوشحالی آید پدید

اور یوں بھی تو سوچیے کہ ایک شہزادہ بادشاہ کے گھر پیدا ہوتا ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے نام کا چرچا پھیل جاتا ہے۔ نہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں میں لوگ اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اس شہزادے کو وہ لذت کہاں مل سکتی ہے جو ایک گم نام دیہاتی بچے کو اس وقت ملتی ہے جب پڑھ لکھ کر زندگی کے میدان میں وہ قدم رکھتا ہے۔ اس کی تقریروں، تجربہ، اصابت رائے، سنجیدہ افکار سے دنیا متاثر ہوتی ہے، ہر جگہ اس کا چرچا پھیلتا ہے، یقیناً گم نامی کے بعد ہی نام آوری سے مسرت ملتی ہے۔

رنج و غم کی یہ کتنی زبردست قیمت ہے۔ یوں رنج و غم سے مسرت اور خوش دلی کی نعمت کو چکھ لینے کے بعد اس وادرِ بے ہمال کے شکر سے چاہیے کہ دل لبریز کر لیا جائے کہ جس نے اس ''العسر'' سے ''یسر'' کو نکالا، **فاذا فرغت** یعنی جب العسر کی پیدائش کے تجربات گزر کر ''خیر و شر'' والی زندگی کو ختم کر لو، تو **الی ربک فارغب** اپنے پالنے والے کی طرف پلٹ پڑو۔ دنیا کے بعد تو جنت کا مزہ لے گا۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہم بھی جنت ہی میں پیدا ہوتے تو جنت بھی شاید ہمارے لیے اسی طرح بے مزہ ہو کر رہ جاتی

جیسے سنتے ہیں کہ کشمیر کے باشندے ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو ہزار ہا روپیہ صرف کر کے وہاں مرغزاروں اور گل وگلزار کی بہاروں کو دیکھ دیکھ کر سر دھنتے ہیں۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کہتے ہیں کہ کشمیریوں کو دیکھا کہ ان باہر سے آنے والے تماشائیوں کے تاثرات پر کشمیریوں کو تعجب ہوتا ہے کہ آخر انھیں کیا مسرت مل رہی ہے۔

مجلس معنوی میں دراصل ذکر ہو رہا تھا ''نور'' کا۔ فرما رہے تھے کہ رات بے نور ہو جاتی ہے۔ رنگ حالاں کہ باقی رہتے ہیں لیکن نور کے نہ رہنے سے رنگ بھی نظر نہیں آتے۔ پہلے رنگوں پر نور منعکس ہوتا ہے اور نظر آدمی کی نور پر پڑتی ہے۔ نور کے توسط سے رنگ نظر آتا ہے۔ جیسے دن میں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب اور دوسرے اجرام نیرہ کا نور رنگ پر پڑتا ہے تب رنگ نظر آتا ہے۔ آدمی رنگ ہی میں غرق ہو جاتا ہے اور نور کی طرف دھیان نہیں جاتا کہ یہ سارا کرشمہ اسی طرح فرمایا کہ آدمی کے باطن میں بھی سرخ وسبز وزرد رنگ نظر آتے ہیں۔ طریقہ ان رنگوں کو دیکھنے کا یہ ہے کہ:

در درون خون بے نفز اور درا   تا ببینی سبز و سرخ و زردرا

مولانا نے سمجھایا کہ بیرونی رنگ جیسے نور کے بغیر محسوس نہیں ہوتا، اسی طرح اندرونی نور کو بھی یقین کرو کہ نور ہی کے توسط سے نظر آتا ہے۔ بیرونی جیسے آفتاب کے نور سے نظر آتا ہے اسی طرح اندرونی رنگ کو غیبی نور کے توسط سے آدمی پاتا ہے۔ فرمایا:

این بروں از آفتاب ورسہات   کوز نور عقل وحس پاک وجداست

گویا دل کا نور، خود بالذات نور نہیں ہے بلکہ نور خدا کے سرچشمہ سے اس کا تعلق ہے۔

یہ نور خدا نہ حواس کی گرفت میں آتا ہے اور نہ عقل کی۔ مثال مولانا نے دی:

''جان ز پیدائی ونز دیکیست گم''

اسی طرح نور حق بھی اپنی پیدائی اور نزدیکی کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نور حق کے سوا انوار ہیں چوں کہ ان کی ضد تاریکی ہے اور ضد کا احساس اس کی ضد کے احساس سے ہوتا

ہے۔خوش دلی کا اِحساس اس رنج دلی میں گرفتار ہونے کے بعد ہوتا ہے لیکن نورحق کا چوں کہ ضد نہیں ہے اس لیے اس کو کیسے محسوس کرایا جائے۔

''چوں کہ حق را نیست ضد پنہاں بود''

اور یہی مطلب حضرت والا کے اس شعر کا ہے:

نورحق را نیست ضدے در وجود تا بضداد راتوں پیدا نمود

(دفتر اول)

راہِ صفا کی جفاؤں کی حقیقت:

۲۶ اگست ۱۹۵۱ء: آج کل برسات کا مہینہ ہے۔ہندی میں اس کو بھادوں کہتے ہیں ۔اس سال برسات کی ابتدا عجب طریقہ سے ہوئی،ابتدا میں ایک اچھی، بلکہ کافی سے زیادہ بارش ہوئی،اس کے بعد بند ہوئی۔حال یہ ہے کہ کبھی کبھی ناکافی ترشح ہو جاتا ہے،جس علاقے میں مقیم ہوں یہاں دھان کی کاشت اصلی کاشت ہے۔چوں کہ دیہات ہے کاروبار ہی یہاں کاشت کاری ہے،بارش کے نہ ہونے سے سارا گاؤں اداس ہے۔خود فقیر کے ہاں بھی کچھ کھیتی ہوتی ہے اور غذائی سرمایہ خاندان کا اسی سے حاصل ہوتا ہے،سخت پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ساون کا مہینہ یوں گزرا کہ اس میں تجربتہً مغربی ہواؤں سے بارش ہوتی ہے۔مہینہ بھر صرف مشرقی ہوا چلتی رہی۔اب بھادوں کا مہینہ آیا اس میں مشرقی ہوا سے بارش ہوتی ہے۔اچانک بھادوں میں ہوا کا رخ بدل گیا۔اب مغربی ہوا چل رہی ہے،آج دل گھبرایا،حضرت کی مجلس کا خیال آیا،حاضری کی سعادت میسر ہوئی۔ارشاد ہو رہا تھا:

ان لوگوں پر تعجب ہے جو صفائی کے آرزومند ہیں۔چاہتے ہیں روح کی صفائی حاصل ہو۔لیکن جب ان کو صیقل کرنے کے لیے جفا کا ظہور ہوتا ہے تو ادھر ادھر بھاگتے ہیں۔شعر یہ تھا۔فرمایا:

من عجب دارم زجویائے صفا کو رمد دَر وقتِ صیقل از جفا

عشق تو ایک دعویٰ ہے۔ ہر دعویٰ کے لیے گواہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گواہ کے بغیر دعویٰ صرف ہوا ہے۔ آدمی کو تو چاہیے کہ دعویٰ دائر کرنے کے بعد قاضی کے اجلاس سے گواہوں کے پیش کرنے کا جو حکم ہو تو بہ خندہ پیشانی گواہوں کو حاضر کر دے۔ اس حکم پر کُڑھنے اور افسردہ خاطر ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ارشاد ہوا کہ گنج (خزانہ) وہی پائے گا جو سانپ (مارگنج) کا بوسہ دینے پر تیار ہو گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صفا کے لیے جو جفا کا ظہور ہوتا ہے تو اس کا رخ صفا چاہنے والے کی ذات کی طرف ہوتا ہے حالاں کہ رخ اس کی طرف نہیں بلکہ صفا کو مکدر کرنے والی صفات کا ازالہ اس جفا سے مقصود ہوتا ہے۔ کمبل گرد سے اٹا ہوتا ہے لوگ اس پر لاٹھی مارتے ہیں تو یہ لاٹھی کمبل پر پڑتی ہے یا گرد پر:

برنمد چوبے کہ آں رامرد زر   برنمد آں راں زد بر گرد زد

گھوڑے پر کوڑا مارنا کیا گھوڑے کو مارنا ہے یا گھوڑے کی بدعنوانی پر، یہ کوڑے اس لیے پڑتے ہیں تا کہ وہ اپنی چال کو درست کرے۔

بہ ہر حال جب تک انگور کے شیرے کو قید نہ کیا جائے گا وہ شراب کی شکل کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ ایک یتیم کو استاد نے تھپڑ مارا، دیکھنے والا بگڑا کہ یتیم کو ستاتے ہو، مارتے ہو؟ استاد نے کہا کہ یتیم کو میں نے کیا مارا بلکہ اس شیطان (دیو) کو میں نے چپت لگائی جو اس لڑکے کے اندر چھپا بیٹھا ہے۔ ماں بچے سے کہتی ہے کہ "مر بھی جائے" تو بچے کو نہیں کہتی، بچے کی بری عادت کی موت کی آرزو کرتی ہے۔ مولانا نے اسی کے بعد فرمایا کہ:

"آدمی کو چاہیے کہ بڑے بول بولنے والوں کی صحبت سے بھاگے، وہ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن جب وقت آتا ہے تو میدان میں ٹھہر نہیں سکتے، بادام تھوڑا ہی ہو لیکن شیریں ہو تلخ بادام کے ڈھیر سے بہتر ہے۔"

کہنے لگے کہ یہودی موت سے کیوں بھاگتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں شک کی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، مسافر جو راستے سے ناواقف ہے ظاہر

ہے راستہ اطمینان سے کیسے طے کر سکتا ہے؟ اس کا حال اگر یہ ہو کہ ایک ایک قدم پر ادھر دیکھتا ہے، اُدھر دیکھتا ہے، چلتا ہے۔ کہیں سے آواز آئی کہ ادھر نہ جانا راستہ بند ہے۔ بے چارہ ٹھٹک جاتا ہے۔ حالاں کہ راہ پہلے سے معلوم ہو تو لوگوں کی چیخ و پکار کی اسے کیا پروا ہو گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بزدلوں کے ساتھ زندگی کی راہ طے کرنے کا ہرگز ارادہ نہ کرنا، جب کوئی وقت آئے گا اور تم ان کو پکارو گے تو یہ تمھیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں گے خواہ لاف زنی میں سحر طرازیوں سے کیوں نہ کام لینا پڑے۔

اسی پریشانی میں "مجلسِ اکبر" کی حاضری سے بھی مشرف ہوا۔ ارشاد ہو رہا تھا:

"سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ آدمی کا دل جس چیز کو چاہے وہ اس کو میسر نہ ہو۔"

اس کے بعد فرمانے لگے کہ:

"ہم تک یہ روایت پہنچائی گئی ہے کہ حق تعالیٰ فرشتے سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی حاجت ابھی پوری نہ ہو، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ اس کی پکار سنوں۔"

اس روایت کو نقل کر کے شیخ نے کہا کہ جس شخص کی حاجت پوری نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ اپنے اندر درد محسوس کرتا ہے لیکن اس دکھ کا منشا حق تعالیٰ کا غصہ نہیں بلکہ رحمت ہوتی ہے۔ قرآن میں بھی اس "دیوار" کا جو ذکر کیا گیا ہے جس کے اندر اور باطن میں تو رحمت ہو گی لیکن باہر و ظاہر میں عذاب ہو گا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ ظاہر باطن ہی کا تابع ہوتا ہے۔ پس دکھ جو کہ دراصل لذت کی نایافت کی تعبیر ہے اس میں رحمت کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے اور ثابت ہوا کہ "الآلام عوارض وللذات ثوابت" (سارے دکھ عارضی ہیں اور لذتیں برقرار رہنے والی ہیں) "فالعالم مرحوم بالذات مثالم مما یعرض" (عالم کو رحم ہی کے لیے اصلاً حق تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور دکھ عالم کا صرف عارضی ہے)۔

شیخ نے بھی اس موقع پر وہی مثال پیش کی کہ بچے کو باپ مارتا ہے اور اس مار سے بچے کو دکھ بھی پہنچتا ہے لیکن درحقیقت اس دکھ میں بھی باپ کی مہربانی ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

شیخ نے پھر بخاری کی اس روایت کا حوالہ دیا جس میں ایک عورت کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کہ۔ "ان اللہ اشفق علی عبدہ من ھذہ علیٰ ولدھا" (اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے زیادہ مہربان ہیں جتنی کہ یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے)۔(ج۳ص۲۷۵)

حدیث جف القلم کی انوکھی تعبیر:

۶ ستمبر ۱۹۵۱ء: مجلس معنوی کے حضور کا ولولہ دل میں موجزن ہوا، حاضر ہو گیا۔ فرمارہے تھے کہ۔ "جف القلم بما ھو کائن" (خشک ہو چکا قلم ہر اس بات کو لکھ کر جو آئندہ پیش آنے والی ہے) اس حدیث کا مطلب لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ ایک پہلو اس کا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمان برداری اور نافرمانی ہر دونوں باتیں برابر نہیں۔ قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ مثال دے کر سمجھانے لگے کہ یوں سمجھو کہ چوری اور امانت یہ دونوں باتیں برابر نتیجہ کے لحاظ سے نہیں ہیں۔ قلم اس قانون کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔ الغرض ہر کام اپنے ساتھ خاص نتیجہ اور اثر رکھتا ہے۔ جو کج چلے گا اس کی کج چال سے کج نتیجہ پیدا ہو گا اور سیدھی راہ چلو گے تو سیدھا نتیجہ تمھارے سامنے آئے گا جس کا دوسرا نام سعادت ہے۔ اسی طرح ظلم وستم کرو گے تو نحوست تم کو پکڑ لے گی اور انصاف سے کام لو گے تو اس کا پھل تمھارے سامنے آئے گا۔

بہرحال اس کا یہ مطلب جو بیان کرتے ہیں کہ کام آدمی کے اختیار حدود سے باہر ہو چکا ہے اور جو کچھ آگے ہونے والا ہو اس سے پہلے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے اور اس مطلب کو سامنے رکھ کر ہر بدکار اپنی بدکاریوں میں بدکاریوں کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے برائیوں کا مرتکب ہو کر آخر میں یہی کہتے ہیں کہ جو برائی مجھ سے صادر ہوئی قلم تو پہلے اس کو لکھ کر خشک ہو چکا تھا۔ پس ذمہ داری مجھ پر نہیں اس قلم پر ہے اور اس پر ہے جس نے یہ سب کچھ اس قلم سے پہلے ہی لکھ چھوڑا ہے۔ ہندی میں جس کی تعبیر اس مشہور شعر کے ساتھ کی گئی۔

نیاؤنہ کیو کیو ٹھکرائی　　　بن کیے لکھ دیو برائی

(مناظراحسن گیلانی)

مولانا نے فرمایا کہ کیوں نہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ انصاف اور بے انصافی برابر نہیں ہیں۔قلم اس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔خیر وشر، برائی اور بھلائی دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوگا۔یہ غلط ہے بلکہ بھلائی کا نتیجہ بھلا اور برائی کا نتیجہ برا ہے۔قدرت کا یہ فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے اور اپنے قلمِ ازل ہی سے قدرت نے لکھ دیا ہے کہ ہر برائی بھی ثمرہ اور اثر کے لحاظ سے برابر ہے بلکہ ہلکی برائی کا نتیجہ بھی ہلکا اور بڑی برائی کا نتیجہ بھی بہت زیادہ برا ہوگا۔اسی وقت قدرت نے خیر اور بھلائی کے سلسلے میں بھی یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ ذرہ برابر نیکی اخلاص کے ساتھ جب بندے کی طرف سے پیش ہوگی تو قدرت کا ہاتھ اس ذرے کو پہاڑ اپنے فضل وکرم سے بنا دے گا۔

ارشاد ہوا ایسا بادشاہ اور حکمران جس کی نظروں میں خائن اور دیانت دار ملازم دونوں ایک ہی جیسے سمجھے جاتے ہیں یا ایسے نوکر بادشاہ ہی نہیں بلکہ اس کی پیٹھ کے پیچھے بھی اس سے لرزاں وترساں ہوں اور جو اسی بادشاہ پر اور اس کی حکومت پر اعتراض کرنے والے، تلاش کر کے اس بادشاہ کی کم زوریوں کو جو پھیلاتے رہتے ہوں دونوں کے ساتھ برابر سلوک روا رکھا جاتا ہو، تو تمھارا فیصلہ اس حکمران کے متعلق کیا ہوگا؟

فرمانے لگے کہ میں تو یہی کہوں گا کہ:

''شاہ نبود خاک تیرہ بر سرش''

الغرض اندھیر نگری کا ایسا اندھا راجا جس کی حکومت میں ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجہ فروخت ہوتا ہو بھلا ایسا راجہ، راجہ کہلانے کا کس طرح مستحق ہو سکتا ہے؟ اس کے سر پر خاک ڈال دی جائے تو بہتر ہے (مناظر گیلانی)

بہ ہر حال کائنات کا نظام جو چلا رہا ہے اس کے ملک میں یہ اندھیر نہیں ہو سکتا بلکہ

ذرہ برابر بھی جو اپنی کوشش میں اضافہ کرے گا وہ اس کے صلے اور نتیجے کو اپنے آگے پائے گا اور قدرت کی ترازو میں ذرہ برابر بھی تل جاتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے:

''اندھیر نگری کے ان اندھے حکمرانوں کے ساتھ میں دیکھتا ہوں تمھارے دل کے تعلق کا یہ حال ہے کہ جان تک ان کے لیے لڑا دینے میں تم پس و پیش نہیں کرتے، حالاں کہ یہ بے چارے اندھے راجہ اور بادشاہ صحیح معنوں میں کچھ نہیں جانتے کہ واقعی ان کا وفادار کون ہے؟ اور کون غدار ہے۔ معمولی چغل خور ان کے کان میں کچھ پھونک آتا ہے اور بادشاہ عمر بھر کی خدمت پر تمھاری، محض اس کی چغلی کی وجہ سے پانی پھیر دیتا ہے''۔

توجہ دلانے لگے:

''ذرا سوچو کہ ہمہ شنوائی ہمہ بینائی والے بادشاہ کے ساتھ ایسی صورت میں تمھارے دل کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ وہی جہاں نہ چغل خوروں کی چلتی ہے اور نہ غمازوں کی۔''

اور ایک دلچسپ بات اسی کے ساتھ یہ بھی فرمائی کہ:

''چغل خوروں اور غمازوں کی وہاں تو چلتی نہیں تب اپنے دل کی بھڑاس وہ یوں نکالتے ہیں کہ ہمارے آگے وہ اس سمیع و بصیر پر گویا حملہ کرتے ہیں اور سمجھاتے پھرتے ہیں کہ میاں! بڑے صاحب نے تو پہلے لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ جو کچھ بھی پیش آنے والا تھا اس کو لکھ کر ان کا قلم خشک ہو چکا، پھر اپنا سر اس میں کھپانا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے مالک کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کر کے حق وفاداری ادا کرنا چاہیے، فضول ہے۔ میاں کہاں کی وفا اور کہاں کی جفا۔ تمھارے ہاتھ میں کچھ رکھا بھی گیا ہے؟''

ذرا تمتما کر تند و تیز لہجے میں فرمانے لگے:

قلم خشک ہو چکا (یعنی جف القلم بما ھو کائن) اس کا مطلب یہ کیوں نکالا جا رہا ہے کہ وفا اور جفا دونوں برابر اور نتیجہ کے لحاظ سے یک ساں ہیں۔ بلکہ سنو! قلم یہ لکھ کر

خشک ہوا کہ جو جفا کے نتیجے کو اپنے سامنے پائے گا اور جفا کرے گا وفا کے ثمر کو پائے گا۔''

ارشاد ہوا کہ :

''معافی اور درگزر کا بھی قانون ضرور ہے لیکن جو امیدیں تقویٰ کے ساتھ قائم ہوئی ہیں ان ہی امیدوں کو اپنے اندر وہ کیسے پال سکتا ہے؟ جو صرف عفو اور درگزر کے قانون اور رحم و کرم کے بھروسے جی رہا ہے۔''

پوچھنے لگے کہ:

''چور نے چوری کی ،فرض کرو حکومت کسی خاص وجہ سے اس کو چھوڑ بھی دے اور درگزر سے بھی کام لے لیکن حکومت میں جو مقام اور جو رتبہ وزیروں اور خزانے کے ذمہ دار افسروں کا ہے اسی مقام اور اسی رتبے کا مستحق یہ چور ہو سکتا ہے؟ جو صرف معافی اور رحم کے قانون کے زیر اثر سزا سے بچ گیا یا بچا دیا گیا۔''

جوش میں فرمانے لگے کہ:

''یاد رکھو! بادشاہ کا لڑکا یا ولی عہد اگر بادشاہ کی خیانت کرے تو اس جرم کی سزا صرف یہی ہے کہ سر اس کے تن سے جدا کر دیا جائے ۔لیکن بادشاہ کا کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو وفاداری کا تجربہ جب اس سے ہوتا ہے تو باوجود غلام ہونے کہ بادشاہ کا وہ محبوب بن جاتا ہے اور غلام بے چارہ تو پھر بھی آدم زاد ہوتا ہے، یہاں تو حال یہ ہے کہ وفادار کتا بھی اپنے مالک کا چہیتا بن جاتا ہے،اسی سے سمجھنا چاہیے کہ کتا جب آقا کا محبوب بن سکتا ہے اور بن جاتا ہے تو وفاداری شیر کی کس نتیجہ کو پیدا کر سکتی ہے۔''

آخر میں ارشاد ہوا :

''سچ تو یہ ہے کہ چور سے بھی جب کوئی معقول خدمت بن جاتی ہے اور راست بازی کا کوئی عمل اس سے صادر ہوتا ہے تو اس کی یہی سچائی ہزار ہا ہزار دست درازیوں کی جڑوں کو نکال کر باہر پھینک دیتی ہے۔''

پھر اسلامی تصوف کی تاریخ کے اس واقعہ کا ذکر فرمانے لگے کہ :

''آج ہم فضیلؒ (ابن عیاض) کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں (سلسلہ تصوف کے ایک گوہر تاباں وہ سمجھے جاتے ہیں) مگر ابتدا میں کون نہیں جانتا کہ ایک ڈاکو اور چور تھے (کہتے ہیں کہ قافلے پر دھاوا کرنے کے لیے کمین گاہ میں رفیقوں کے ساتھ فضیل چھپے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا، قافلہ سے ایک آواز بلند ہوئی۔ یہ قرآن کی مشہور آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ''کہ ایمان والوں کے لیے اس کا وقت نہیں آ گیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد کی طرف جھک پڑیں اور ان باتوں کی طرف جو خدا نے پیغمبر کے ذریعے نازل فرمائی ہیں'' فضیلؒ کے کان میں آواز آئی اور سینے سے ان کے خروش بلند ہوا کہ ہاں وقت آ گیا، وقت آ گیا۔''

''(واقعی وقت آ چکا تھا کہ ڈاکوؤں کے گروہ سے وہ باہر نکلے اور اہل اللہ کے مجمع میں شریک ہو کر اپنے وقت کے قطب اور آئندہ اللہ کی راہ پر چلنے والوں کے پیشوا بن گئے)۔''

مولانا نے ان جادوگروں کا تذکرہ بھی کیا جو فرعون کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اتر آئے تھے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشانی سے سچائی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، ان سے وہ تلملا اٹھے اور فرعون کی دھمکی کہ کھجور کے تنوں میں باندھ کر میں تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا، اس کی بھی پروا نہ کی اور کہنے لگے کہ:

''فاقض ما انت قاض ''(تیرے جو جی میں آئے کر گزر) (ص ۴۶۵)

اس بیان کے بعد مولانا نے مخاطب کر کے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساحروں میں سچائی اور صداقت کی جو تابناک چمک اٹھی یا فضیلؒ میں توبہ وانابت کا جو سمندر موجزن ہوا تھا تو اس سے تم اپنی چند روزہ ٹوٹی پھوٹی عبادت کا موازنہ نہ کرنا۔ سو سال کی عبادت ایک طرف اور ایک لمحے کا وہ اخلاص جو ساحروں میں جلوہ گر ہوا تھا ایک طرف۔

پھر ایک دلچسپ قصہ سنانے لگے، اللہ والوں کا معاملہ اللہ میاں کے ساتھ اور ہوتا ہے ہم عامی لوگ یہی معاملہ خدا کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ قصہ شہر ہرات میں پیش آیا۔ اس زمانے میں مشہور خواجہ عمید خراسانی حکومت کے وزیر تھے۔ اپنے غلاموں کو وہ زرق برق لباس میں

رکھتے۔شہر میں ایک دن ان کے غلام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جا رہے تھے، ایک ظریف منچلے آدمی کی نظر ان غلاموں پر پڑی، پوچھا کہ یہ اطلس در بر، اور زریں کمر کون لوگ ہیں؟ اطلاع دی گئی کہ عمید خراسانی وزیر کے غلام ہیں۔ سنتے ہی دیکھا گیا کہ اس ظریف کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں اور کہہ رہا ہے کہ :

''غلاموں کے پالنے کا ڈھنگ کاش! ہمارے شہر کے وزیر سے آپ سیکھتے، دیکھیے یہ ہے بندہ پروری کا طریقہ۔''

مولانا نے فرمایا کہ منچلا آدمی دل والا تھا۔اس وقت اس کے بدن پر چیتھڑے لٹک رہے تھے اور سردی کی شدت سے بے چارہ کانپ رہا تھا۔دل میں موج آئی زبان سے یہ فقرے نکل پڑے۔لیکن ہرایرے غیرے نتھو خیرے کو اس قسم کی جرأتِ بے جا پر دلیر ہو جانا مناسب نہیں ہے۔حق تعالیٰ کے نیاز مندوں کو ناز کی بھی اجازت ہے۔بادشاہ کے مصاحبوں کو دیکھ کر، شہر کا کوئی عامی، بادشاہ کے ساتھ مذاق اور ہنسی کی گفتگو کی اگر جسارت کرے گا تو اس کا نتیجہ اسے خود بھگتنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھانے لگے کہ اس منچلے آزاد نے جو بات کہی وہ بھی کب ٹھکانے کی تھی۔نظر خواجہ عمید کے غلاموں کے زریں کمر بند پڑی، وہ ان ٹوپیوں کو تو دیکھ رہا تھا جو جواہر سے جگمگا رہی تھیں لیکن جس نے کمر بند نہیں کمر ہی عطا فرمائی، اور ٹوپیاں ہی نہیں جن سروں کو ٹوپیوں سے ہم چھپاتے ہیں ان کو اس کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔الغرض:

حق میاں داد و میاں بہ از کمر گر کسے تاجے دہد او سر دہد

آگے قصے کا تتمہ بھی سن لیجیے، مولانا ہی نے بیان کیا ہے کہ:

''اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد خواجہ عمید سے بادشاہ بدگمان ہوا اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ وزیر صاحب تو جیل روانہ ہوئے اور ان کے غلاموں کو بادشاہ نے شکنجے میں کس کس کر دریافت کرنا شروع کر دیا کہ اپنے روپے وہ کہاں کہاں رکھتا تھا۔جہاں جہاں اس کے

وظیفے محفوظ ہیں ان کا پتا دو، ورنہ سب کی گردنیں اڑا دی جائیں گی۔ایک مہینے تک غلاموں پر ظلم وستم کا سلسلہ بادشاہ کی طرف سے مسلسل جاری رہا۔لیکن غلاموں میں کوئی نہ کھلا، آخر عبرت کے لیے ان ہی غلاموں میں سے ایک غلام کے ٹکڑے ٹکڑے سب کے سامنے کر کے دکھائے پھر بھی نہ یہ قتل ہونے والا غلام ہی کھلا اور نہ اس کو دیکھ کر دوسرے غلام افشائے راز پر آمادہ ہوئے۔''

جس دن غلام کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا یہ دردناک واقعہ پیش آیا اسی دن کے بعد رات پھر آئی، وہی ظریف من چلا آدمی جو اللہ میاں کو بندہ پروری کے متعلق خواجہ عمید سے سبق پڑھنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ:

بندہ پروردن بیاموز اے

اسی کے خواب میں آنے والا آیا اور کان میں اس کے کہہ رہا تھا:

''بندہ بودن ہم بیاموز وبیا''

مطلب یہ تھا کہ بندہ پروری کا طریقہ خواجہ عمید سے سیکھوں، تم نے جو یہ کہا تھا تو میں یہ کہتا ہوں کہ بندہ بننے کا طریقہ خواجہ عمید کے غلاموں سے تم کو سیکھنا چاہیے۔ (دفتر پنجم)

اللہ والوں پر اللہ کی محافظت:

۱۶ستمبر ۱۹۵۱ء کو مجلس معنوی تک رسائی کی عزت حاصل ہوئی۔قصہ بیان کر رہے تھے خود ہمارے ہندوستان کا شعر تھا:

آں شنیدستی کہ در ہندوستاں   دید دانائے گروہے دوستان

یعنی ایک دانش مند کی نظر دوستوں کے ایک گروہ پر پڑی، یہ مسافر لوگ تھے۔زادراہ ختم کر چکے تھے، بھوکے پیاسے تھے اور بڑی مسافت طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔انھیں آگے بھی جانا تھا۔دانش مندان مسافروں کو دیکھ کر خوش ہوا اور گرم جوشی سے ملا۔سلام وکلام کا سلسلہ دونوں کے درمیان جاری ہوا۔مسافروں کو دانش مند نے سمجھانا شروع کیا:

''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ بھوک اور پیاس کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور اس کربلا کے میدان میں آپ تکلیفوں کا شکار ہو گئے۔لیکن میری ایک بات سنیئے! آگے آپ کو ہاتھیوں کا جنگل ملے گا، جس میں ہاتھی کے بڑے موٹے فربہ بچے دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے، ان کا شکار بھی بہ آسانی آپ لوگ کر سکتے ہیں اور ان کے گوشت کا کباب بھی بہت لذیذ ہوگا۔مگر یاد رکھیں جہاں آپ کو یہ بچے نظر آئیں وہاں ان کی مائیں ہتھنیاں بھی چھپی ہوں گی۔ان ہتھنیوں کا دستور ہے کہ ان کے بچے کا شکار کر کے جو کھا جاتے ہیں خواہ سینکڑوں میل بھاگ کر دور کیوں نہ نکل جائیں لیکن ان کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آتیں اور اپنے بچوں کے کھانے والوں تک پہنچ کر ختم ہی کر کے دم لیتی ہیں۔دانش مند ان کو طرح طرح سے سمجھاتا ہے اور راز بتایا کہ ان ہتھنیوں کی قوتِ شامہ میں غیر معمولی ذکاوت ہوتی ہے۔سونگھ کر وہ اس بات کا اندازہ لگا لیتی ہیں کہ کس نے ان کے بچوں کا گوشت کھایا ہے۔ پھر حد سے زیادہ بے رحمی کا برتاؤ ان کے ساتھ غصے میں کرتی ہیں، دانش مند نے چونکاتے ہوئے کہا کہ:

آتش دود آید از خرطوم اُو الحذر زاں بچۂ مرحوم اُو

''غضب ناک ہتھنیوں کی سونڈ سے آگ کا دھواں نکلتا رہتا ہے۔خبردار خبردار ان کے بچے کو نہ چھونا۔'' مگر ہوا یہ کہ مسافروں نے دانش مند کی باتیں تو سن لیں اور آگے بڑھ گئے۔راستے میں جیسا کہ دانش مند نے کہا تھا وہ جنگل واقعی آ گیا، جس میں ہاتھیوں کے بچے کلیلیں کر رہے تھے۔ان کے نرم نرم فربہ گوشت کو دیکھ کر ہر ایک کا دل للچانے لگا۔ بہ آسانی پایا کہ ہاتھ میں بھی آ سکتے ہیں۔آخر ایک بچے کو ہاتھی۔ کے ان بھوکے مسافروں نے پکڑ لیا اور دانش مند کی نصیحت کہ کچھ بھی ہو جائے گھاس ہی کھانا پڑے لیکن ہاتھی کے بچے کو نہ پکڑنا، اس کی پروا کسی نے نہ کی، صرف ایک مسافر بے چارہ دانش مند کی نصیحت کو یاد دلاتا رہا۔لیکن حرص، لالچ اور بھوک کی شدت نے سب کو بہرا بنا دیا اور بچے کو پکڑا گیا، ذبح کیا گیا، لکڑیاں جمع کر کے کباب اس کے گوشت کا ان مسافروں نے لگایا اور خوب پیٹ بھر کر اس کو نوشِ

جان کیا۔ البتہ وہی ایک مسافران کومنع کرتا رہا۔ اس نے کھانے میں شرکت نہ کی۔ کھاپی کر جب سیر ہو گئے تو درخت کی چھاؤں کے نیچے سب لیٹ گئے، اور وہی ایک مسافر جس نے کھانے میں شرکت نہیں کی تھی بھوک کی تکلیف کی وجہ سے جاگتا رہا۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ ایک دیوانی ہتھنی تیزی کے ساتھ بھاگتی ہوئی سامنے سے آرہی ہے۔ دل اس کا تھرّا گیا، سمجھ گیا کہ جس کا بچہ ذبح کر کے کھایا ہے یہ وہی ہتھنی ہے، جیسا کہ دانش مند نے کہا تھا آ گئی۔ بھاگ نہیں سکتا تھا، سوچ ہی رہا تھا کہ سر پر اس کے ہتھنی کھڑی ہوئی تھی، وہی چونکہ جاگ رہا تھا ہتھنی نے پہلے تو اس کے منہ کو سونگھا اور پیٹ کو بھی سونڈ سے ٹٹولا۔ لیکن اس نے گوشت چونکہ ہاتھی کے بچہ کا نہیں کھایا تھا، اس کو چھوڑ دیا اور سونے والوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ ایک ایک کا منہ سونگھتی جاتی تھی اور بچے کے گوشت کی بو محسوس کر کے سونڈ سے اس کو اوپر اٹھاتی اور چرخ دے کر زمین پر پٹک دیتی تھی۔ جس سے ہڈیاں چور چور ہو جاتی تھیں۔ یہی سلوک اس نے ہر ایک کے ساتھ کیا جس کے منہ سے گوشت کی بو آتی۔ بالآخر سب کو مار ڈالا۔

اس قصے کے ساتھ مولانا نے فرمایا کہ، دیکھو! جیسے ہتھنی اپنے بچوں سے الگ ہو کر جنگل میں چرتی ہے اور بچوں کو بظاہر تنہا چھوڑ دیتی ہے لیکن اس کی توجہ مسلسل بچے ہی کی طرف رہتی ہے جو بھی اس کے بچوں پر ہاتھ ڈالے گا ہتھنی اس کو ختم کر دیتی ہے۔ کچھ یہی حال اللہ کے کچھ دوستوں کا سمجھو جو بہ ظاہر دنیا میں تنہا نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس ساز و سامان بھی حفاظت کا نہیں ہوتا۔ لیکن ولایت کا رشتہ خدا کے ساتھ ان کو جو ہوتا ہے اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر ہاتھ ڈالنے والے تباہ و برباد کر دیے جاتے ہیں۔

کہنے لگے کہ قرآن میں ہی دیکھو اکیلے موسیٰ علیہ السلام یا نوح علیہ السلام ان لوگوں کا کیا کر سکتے تھے جو ان کے برسرِ مقابلہ کھڑے ہو گئے تھے لیکن خدا کے ساتھ ان کا جو رشتہ تھا اس نے ان دشمنوں کو ختم کر دیا۔ فرمانے لگے، بے چارے لوط علیہ السلام کو ان کے شہر والے نکالنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مگر جاؤ بیت المقدس کے راستے میں سیاہ پانی کی ایک

جھیل تم کو ملے گی۔ لوط علیہ السلام کا شہر اس مقام پر تھا۔ بستی الٹ دی گئی، اور سیاہ پانی ایک جھیل کی شکل میں وہاں جھلک رہا ہے۔

فرمانے لگے بھائی! اس قصے کو میں کہاں تک طول دوں۔ جگر کیا پہاڑ بھی پگھل جائے اگر ان قصوں کو سنایا جائے۔ مگر گدازی کے اس منظر کو ہر ایک دیکھنے کی اپنے اندر تاب نہیں رکھتا، ان دیکھنے والوں کو تم دیکھنے والا سمجھتے ہو جنھیں اونٹ میں صرف اون نظر آتی ہے۔ مگر اس میں جو گوشت اور چربی اور دوسرے کمالات ہیں ان سے وہ اندھے ہیں۔ عجیب لوگ ہیں حرص اور لالچ کے زیر اثر ایک ایک بال کی لوگ کھال نکالتے ہیں لیکن واقعی جو اونٹ ہے اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں (کائنات کے ذرے ذرے کو اپنی تحقیقات کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں لیکن کائنات کا ظہور جس وجود کے ساتھ وابستہ ہے اس سے یہ اندھے ہیں۔

(مناظر احسن گیلانی)

یہ دنیا کے حریص ناچتے ہیں لیکن ان کا ناچ ریچھ کا ناچ ہے جس کا کوئی مطلب ہے نہ معنی۔ لیکن کبھی کبھی رقص کی حالت ان لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے جو اپنی خودی سے نکل کر بے خودی میں ڈوب جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے جب نکل جاتے ہیں تو ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس رقص اور ان تالیوں کا مطلب ہی کچھ اور ہے۔ ریچھ کے رقص پر ان کو قیاس کرنا غلط ہے۔

بہ ہر حال اپنے کانوں سے خرافات کی روئی جب نکل جاتی ہے تب آدمی سنتا ہے ان تالیوں کو جو درختوں کے پتے بجا رہے ہیں۔

فرمانے لگے کہ کان کو، لا حاصل، بے نتیجہ مسخرگی کی باتوں اور دروغ بافیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرو۔ تم کو روح اور جان والے شہر اپنی روشنی اور چمک دمک کے ساتھ دکھائی دینے لگیں گے۔ دیکھو! اپنے منہ کو مذاق اور ٹھٹھول سے پاک رکھو اور دوست کے چہرے کی داستان کے سوا اور کسی چیز کا ذکر مت کرو۔ محمد رسول اللہ ﷺ کیا تھے؟ ''حق'' کے لیے ان کا وجود صرف کان اور صرف آنکھ بن کر رہ گیا تھا۔

ہتھنی سونگھ سونگھ کر اپنے بچے کا گوشت کھانے والوں کا پتا چلا لیتی ہے،اس جز کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے بندوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی غیبت کرتے ہیں ان کو بھی چونک جانا چاہیے کہ سونگھنے والا سونگھ سونگھ کر اس کا سراغ لگا لے ہی گا۔اور صرف وہی بچ جائے گا جس کے منہ سے گوشت کی بو نہ آئے گی۔فرمانے لگے ہائے ہائے! جب منکر نکیر قبر میں ہر ایک کے منہ کو سونگھیں گے اور گوشت کھانے والوں کو نہ کھانے والوں سے الگ کریں گے، یہ وہ وقت ہوگا کہ کوئی حیلہ وحوالہ کام نہ آئے گا۔منہ کو الائچی چبا کر یا لونگ رکھ کر خوش بودار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔اپنے ساتھ پھوڑے پھنسیاں لے کر قبر میں جو جو پہنچیں گے ان پر، ان کے گھاؤ پر منکر نکیر کے گرز پڑیں گے۔اس وقت اس دکھ اور تکلیف کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہے، فرمانے لگے کہ قبر سے پہلے اس دنیا میں عزرائیل کا جب گرز پڑتا ہے تو تم میں کوئی اس گرز کو دیکھتا ہے کیا؟ مگر بڑے بڑے پہلوانوں کا پرخچہ نکل جاتا ہے۔حالاں کہ نہ لکڑی کا دستہ گرز کا نظر آتا ہے اور نہ لوہا۔

ارشاد ہوا کہ ہاں! کبھی بیماروں کو گرز بھی نظر آتا ہے اور اس کا دستہ اور لوہا سب کچھ۔ بیمار چلاتا ہے کہ میرے سر پر کوئی تلوار چلا رہا ہے، کوئی بھالے بھونک رہا ہے لیکن تیمار دار کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ تم کو مالیخولیا ہو گیا ہے۔نہ یہاں کوئی تلوار ہے، اور بھالا نہ نیزہ۔لیکن بیمار کہے جاتا ہے کہ میں تو سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔(دفتر سوم)

انسانی عمر اور اس کی قدر دانی کی تاکید:

مولانا نے فرمایا کہ بعض اوقات مرنے والوں کو مرنے سے پہلے اس قسم کے مناظر نظر آتے ہیں۔وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ دنیا سے رشتہ اس حرص کا کمزور ہو جاتا ہے اور دوسری دنیا کی چیزیں اب ان کے سامنے ہویدا ہونے لگتی ہیں، اور یوں ان کی بینائی تیز ہو جاتی ہے۔کہنے لگے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ نزع کی حالت مرنے سے کچھ دیر پہلے طاری ہوتی ہے، حالاں کہ اگر سوچا جائے تو نظر آئے گا کہ ہر لحہ آدمی پر نزع کی یہ کیفیت طاری ہے۔جسم سے

جان کا رشتہ کمزور پڑتا چلا جاتا ہے۔اسی لیے چاہیے کہ ہر لمحہ اپنے ایمان کی نگرانی آدمی کرتا رہے۔فرمایا کہ عمر آدمی کی سمجھو کہ ایک تھیلی ہےاور دن رات کی مثال روپے کی ہے۔ تھیلی سے روپے اگر خرچ ہوتے رہیں اور ان کی جگہ نئے روپے اس میں نہ ڈال دیے جائیں تو تھیلی بالآخر خالی ہوکر رہے گی ۔ پہاڑ ہی کیوں نہ ہو، اگر ہر روز ایک پتھر نکالا جائے اوراس کی جگہ پتھر جمایا نہ جائے تو یقیناً ایک دن وہ بھی آئے گا کہ پہاڑ بھی ختم ہوجائے گا۔

ارشاد ہوا کہ چالاکی اور زیرکی کا اقتضاء یہ ہے کہ جتنا نکالا جائے اسی قدر نئے روپوں سے بھرا جائے ۔یوں یہ تھیلی کبھی ختم نہ ہوگی ۔عمر کی تھیلی میں نئے سکوں کے بھرنے کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تم سجدوں میں سجدوں کا اضافہ کیے جاؤ۔قرآن میں فرمایا گیا کہ جو کائنات کی ہر مرکزی قوت سے استفادہ کرنا چاہتا ہےاس کو ''و اسجد'' کے حکم کی تعمیل میں سرگرمی دکھانی چاہیے "اقترب"کا نتیجہ خود بہ خود سامنے آتا جائے گا۔

فرمانے لگے کہ تمھاری تگ ودود دیکھتا ہوں کہ زندگی کے ہر لمحے میں جاری ہے۔لیکن دین کی راہ میں مٹھے (سُست) بیل بن کر بیٹھ جاتے ہو۔حالاں کہ کام اگر کچھ آئے گی تو وہی دادودہش، سعی وکوشش جو دین کی راہ میں کروگے۔مولانا کا شعر تھا:

در تمامی کارہا چندیں مکوش جز بکارے کہ بود در دیں مکوش

(ترجمہ)''ہر معاملے میں اتنی دوڑ دھوپ سے کام نہ لو بس دین کا کام ایسا کام ہے جس کے لیے کدوکاوش کرنی چاہیے۔''

اسی کے ساتھ مولانا کہنے لگے کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مقبروں اور گورستانوں کی آبادی کا مطلب یہ سمجھتے ہوئے کہ بڑے بڑے گنبدان میں کھڑے کیے جائیں، پختہ سنگین تعویذ قبروں کے بنائے جائیں، کہنے لگے کہ گورستان کی صفائی تو اندر کی صفائی سے حاصل ہوتی ہے۔احمق باہر کو صاف کرتے ہیں، چاہیے کہ آدمی اپنی موجودہ زندگی میں اپنی خودی کی قبر کھودے اور ہمیشہ کے لیے اس میں ماؤمن کے قصے کو دفن کردے۔الغرض:

گور خانہ قبہ ہاؤ کنگرہ　　　نبود از اصحابِ معنی آں سرہ

یعنی یہ قبوں اور کنگریوں والے قبرستان کی اہلِ معنی کے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے۔

(دفتر سوم)

حرص و طمع آدمی کو اندھا کر دیتی ہے:

۱۲۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء: پھر وہی زنجیر جس سے تیس سال کی جدوجہد کے بعد خلاصی میسر آئی ہے بعض لوگوں کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں کہ کھڑک رہی ہے۔ چاہا جا رہا ہے کہ وہی زنجیر پھر پہنا دی جائے۔ پہلے اگر نقرئی تھی تو اب طلائی رنگ چڑھا کر لانے والے سامنے لا رہے ہیں۔ مولانا معنوی یاد آئے، ان کی معنوی مجلس تک افتاں و خیزاں پہنچا۔ فرما رہے تھے:

حرص اور طمع سے آدمی اندھا بن جاتا ہے۔ شعر تھا:

حق ترا باطل نماید از طمع　　　در تو صد کوری از طمع

یعنی ''سچ''، طمع اور حرص کی وجہ تجھے جھوٹ دکھائی دے گا اور اس حرص کی وجہ سے اندھے پن میں مزید اندھے پن کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔''

پھر سمجھانے لگے، عالم کے اس نظام کو سمجھو کہ، کیا ہو رہا ہے۔ ہر رزق کے لیے قدرت نے یہاں رزق مقرر فرمایا ہے:

''رزق ہا را، رزق ہا اومی دہد''

مٹی کیچڑ بن کر گھاس کے لیے روزی بنتی ہے۔ اور گھاس جانوروں کی روزی بنتی رہتی ہے اور حیوان جب گھاس کی روزی پا کر خوب تنومند اور موٹا ہو جاتا ہے تب وہی حیوان انسان کی روزی بن جاتا ہے۔ فرمایا دیکھ رہے ہو سارے عالم میں یہی قانونِ عام نافذ ہے:

''جملہ عالم آکل و ماکول داں''

(یعنی سارے عالم کو لو اس میں ہر کھانے والا خود بھی دوسرے کی غذا ہے۔ کھانے والا کھایا جاتا ہے)۔

اور دوسری بات یہ سمجھو کہ روزی کا تابع کھانے والوں کا مزاج ہوتا ہے۔ مٹی کھانے والوں کو دیکھا ہوگا کہ چہرے ان کے زرد، رونق سے محروم، طرح طرح کے امراض کے شکار ہیں۔ یہ غذا ہی کا اثر تو ہے۔ جو کھانے والے کے جسم پر نمایاں ہوتا ہے۔

تیسری بات غور کرنے کی یہ ہے کہ روزی کی ایک قسم جب یہاں بند ہوتی ہے تو قدرت کی طرف سے دوسری روزی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بچے کا دودھ جب ماں چھڑا دیتی ہے تو کیا بچہ بھوکا مر جاتا ہے؟ دودھ سے بہتر غذا قدرت کی طرف سے بچے کے لیے مہیا کر دی جاتی ہے۔ دودھ چھوٹا تو روٹی، پلاؤ، کباب اور قورمہ کی رکابیاں اس کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔

مولانا نے فرمایا، بلکہ آگے بڑھ کر ذرا اور سوچو، ماں کے دودھ سے پہلے بچے کو جب وہ رحم مادر میں ہوتا ہے کیا غذا ملتی ہے؟ حیض کا خون! پھر یہ خون والی روزی بھی بند ہو جاتی ہے۔ تب وہ قورمہ اور پلاؤ، سیب اور انگور، بالائی، اور برفی، شکر پارے اور گلاب جامن والی روزی سامنے آ جاتی ہے۔ ''پھر نتیجہ کچھ سمجھ میں آیا''؟

کاش! طمع کا پردہ آنکھوں پر حائل نہ ہوتا! تو آگے بھی لوگوں کی نظر جا سکتی تھی۔ دکھانے والے، اللہ کی طرف سے دکھانے والے، اللہ کا پیغام لانے والے کیا دکھا رہے ہیں؟ کیا سنا رہے ہیں؟ مولانا نے فرمایا مگر شکمِ مادر سے باہر کی دنیا کا پیغام لے کر اگر اس بچے کے پاس کوئی پہنچے جو ماں کے رحم میں اوندھا پڑا رہتا ہے اور چاروں طرف سے گندگی اسے گھیرے اور لپیٹے رہتی ہے اور ان ہی گندگیوں کی نجاست کی چادر میں لپٹا ہوا بے چارہ ناف کی راہ سے ایام کے زمانہ کا خون چوستا رہتا ہے۔ اسی پر اس کی زندگی اور نشو ونما کا دارو مدار ہے۔ اس موقع پر شکم کے باہر کی دنیا کا پیغام اگر اسے دیا جائے تو سنانے والا سنائے گا کہ:

''دیکھ جس رحم میں تو الٹ پلٹ ہو رہا ہے اس کے باہر ایک پر فضا وسیع دنیا ہے۔ مسرتوں اور لذتوں کے سازو سامان سے پٹی ہوئی دنیا ہے۔ نت نئی نعمتوں سے لبریز ہے،

اس میں اونچے اونچے پہاڑ اگر ایک طرف اپنی شوکت وصولت کا نظارہ پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف فراٹے بھرنے والے دریا اور سمندر اپنے دیدہ زیب منظر سے نگاہوں کو سرور اور دلوں کو نشاط و نور سے بھر دیتے ہیں۔ الغرض جدھر دیکھو:

کوہ ہاو بحر ہاو دشتہا ، بوستانہا ، باغہاو کشتہا

کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ اوپر آسمان کا وسیع خیمہ تنا ہوا جس میں سورج اور چاند تارے جگمگاتے رہتے ہیں۔ رحم مادر سے قدم باہر نکالو تو سہی یہ سارا سماں تمھارے پیش نظر ہو جائے گا جس کے لیے تمھیں کوئی قیمت ادا نہ کرنی پڑے گی۔''

مولانا نے فرمایا لیکن جانتے ہو رحم مادر سے باہر کے متعلق اس ''پیغام'' کے پہنچانے والے کے ساتھ پیٹ کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے اس بچے کا برتاؤ کیا ہوگا؟ اس کے سوا کہ پیغام پہنچانے والے کی یہ ساری باتیں اسے محض خود تراشیدہ افسانہ معلوم ہوں گی، وہ اور کیا کہے گا، ناممکن ہے، محال ہے، یہ نہیں ہو سکتا۔ بس اس کی رٹ لگا تا رہے گا۔ آخر تاریکی اور تنگی کے سوا سے کسی چیز کا تجربہ ہی نہیں ہوا ہے تو رحم سے باہر کی دنیا کی وسعتوں اور فراخیوں کا اندازہ وہ کیسے کرے؟ مولانا نے فرمایا کہ بس یہی حال ہے ان لوگوں کا جو اس دنیا کے رحم میں الجھے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔ پیغام دینے والے مسلسل دیتے چلے جا رہے ہیں کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک اور عالم ہے جس کے مقابلے میں ایک اندھے کنویں اور تیرہ تار غار سے زیادہ وقعت اس دنیا کی نہیں ہے۔ مگر خون کا مزہ اس مزے کے لالچ میں اسیر ہونے والے بچے کے لیے ''رحم سے باہر کچھ نہیں ہے'' کا فیصلہ صحیح فیصلہ قرار دیتا ہے۔ یہی حال ہے ان لالچیوں کا جن کی نگاہوں پر دنیا کی مسرتوں اور لذتوں کی خواہش کا پردہ پڑا ہوا ہے، اور اس دنیا سے باہر بھی دنیا ہے، اس کے امکان تک کے دروازے کو ان کی عقل پر اسی خواہش کا زور بند کیے رہتا ہے۔ الحاصل:

طمعِ ذوق ایں حیاتِ پُر غرور از حیات راستینت کرد دُور

''موجودہ زندگی کی پر فریب حرص اور اس دنیا کے لالچ کی طرف سے بھی اپنے اندر بے زاری پیدا کرو، اسی کے بعد تمھارے سامنے وہ آستانہ آجائے گا جس پر سر رکھنے کے ساتھ ہی پستی بلندی سے بدل جاتی ہے۔''

کہنے لگے:

''میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اس آستانے پر پہنچنے کے ساتھ ہی پہلا اثر اپنے اندر پاؤ گے کہ خوشی اور غم کے جھنجھٹوں سے تم اپنے کو پاؤ گے کہ چھوٹ گئے، تب تمھاری جان کی آنکھ روشن ہو جائے گی۔ تمھارے اندر صرف دین ہی کا نور چمک اٹھے گا جس میں کفر کی سیاہی کا کوئی ریشہ نہ ہوگا۔''

فرمارہے تھے کہ تم امن و امان چاہتے ہو، ڈر اور خوف سے چاہتے ہو کہ نجات مل جائے تو پھر:

''پند پیراں راپذیرا شو بجاں''

یہ ''پیراں'' وہی لوگ ہیں جو اس دنیا کے رحم میں لوٹنے والوں کے پاس اس سے بھی زیادہ وسیع عالم کے نظام کا پیغام پہنچارہے ہیں کہ اس سراپا انتشار اور صرف اضطراب والی دنیا کے مقابلے میں ایک عالم اور بھی ہے۔ جہاں صرف سکون ہے، اضطراب نہیں ہے۔ جہاں صرف آسودگی ہے بے اطمینانی نہیں:

ایں جہاں و ساکنانش منتشر
وآں جہاں و ساکنانش مستتر

باب سوم

مولانا رومؒ کی بصیرت افروز حکایات

سیدنا یوسفؑ کی اپنے دوست سے تحفہ طلبی

ایک دفعہ حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کا ایک دوست بڑی دور سے ان سے ملنے کے لیے آیا۔ دونوں بچپن کے یار تھے۔ اثنائے گفتگو میں اس نے حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے ظلم اور حسد کا واقعہ یاد دلایا۔ آپؑ نے فرمایا کہ وہ مصیبت ایک زنجیر تھی اور میں ایک شیر۔ جس طرح زنجیر میں جکڑے جانے سے شیر کی کوئی اہانت نہیں ہوتی اسی طرح میں نے بھی قید میں پڑ کر کوئی بے عزتی محسوس نہیں کی اور اللہ سے شکوہ نہیں کیا:

شیر را بر گردن از زنجیر بود
بر ہمہ زنجیر ساراں میر بود

اگر شیر کی گردن میں زنجیر پڑی ہو تو تب بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تمام جانوروں کا سردار ہوتا ہے۔

دوست نے پوچھا: ''قید خانے اور کنویں میں آپ پر کیا گزری؟''

فرمایا جیسے چاند کا حال زوال (گھٹنے) کی راتوں میں ہوتا ہے۔

اس گفتگو کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے کہا کہ ارے میاں تو میرے لیے کیا سوغات لایا ہے۔ ذرا وہ تو دکھا۔ دوستوں کے پاس خالی ہاتھ جانا ایسا ہے جیسے آٹے کی چکی پر بغیر گیہوں کے جانا۔

مہمان دوست حضرت یوسفؑ کے مطالبے پر بہت شرمندہ ہوا اور کہا کہ میں نے آپ

کے شایانِ شان تحفہ ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ بھلا میں ایک رتی سونے (یا دانہ جواہر) کو کان زر (یا کان جواہر) اور ایک قطرہ آب کو دریا کے پاس کس منہ سے لاتا۔ آپ کے خزانے میں کون سی چیز ہے جو موجود نہیں۔ البتہ ایک چیز آپ کے پاس ایسی ہے کہ اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی وہ آپ کا حسن و جمال ہے چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ آئینہ بطور سوغات آپ کی خدمت میں پیش کروں جو عاشقان الٰہی کے سینۂ پُرنور کی طرح صاف اور روشن ہو اور آپ اس میں اپنا روئے زیبا دیکھ کر مجھے یاد کر لیا کریں۔

یہ کہہ کر اس نے بغل سے آئینہ نکالا اور حضرت یوسفؑ کے سامنے رکھ دیا کیونکہ حسین آدمی کے سامنے آئینہ آتا ہے تو وہ اس کے دیکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے (جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ باطن عطا کیا ہوتا ہے وہ اپنے حسن و جمال میں اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال اور کاریگری کا تماشا دیکھتے ہیں اور ان کی زبان پر بے اختیار حق تعالیٰ کی حمد و ثناء جاری ہو جاتی ہے)۔

حضرت لقمان حکیم پر تہمت تراشی

حضرت لقمان ایک شخص کے غلام تھے جو ان کو اپنے تمام غلاموں میں حقیر ترین سمجھتا تھا۔ وہ امیر اپنے غلاموں کو باغ سے پھل توڑنے کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ لقمان بھی ان کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ بظاہر سیاہ فام تھے لیکن بباطن بڑے نیک سیرت اور دانش مند۔

دوسرے غلام توڑے ہوئے پھلوں میں سے اکثر خود کھا جاتے تھے۔ ایک دفعہ مالک کو خبر ہوئی تو غلاموں نے اپنی گلو خاصی کرانے کے لیے سارا الزام حضرت لقمان پر رکھ دیا اور کہہ دیا کہ سارے میوے لقمان چٹ کر گیا ہے۔ مالک بہت خفا ہوا اور حضرت لقمان پر سختی کرنے لگا۔ چونکہ وہ تحقیق کیے بغیر حضرت لقمان سے بدگمان ہو گیا تھا۔ انھوں نے اس سے عرض کی کہ اے مالک خیانت کرنے والا شخص خدا کے سامنے رحمت کا امیدوار بن کر نہیں جا سکتا۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم سب کی آزمائش کی جائے۔ وہ اس طرح کہ ہم سب کو پیٹ بھر کر گرم پانی پلایئے پھر ایک جنگل میں سوار ہو کر گھوڑا دوڑایئے اور ہم سب آپ کے گھوڑے کے ساتھ دوڑیں۔ پھر آپ کو میوہ چُرانے والے بدکار کا پتہ چل جائے گا۔ مالک نے اسی طرح کیا اور تمام غلاموں کو گرم پانی پلا کر چکر کے ساتھ ایک بڑے میدان میں خوب دوڑایا۔ اس بھاگ دوڑ سے غلاموں کا جی متلانے لگا اور وہ قے کرنے لگے اور مالک پر روشن ہو گیا کہ ان پر تہمت لگانے والے خود چور تھے :

حکمتِ لقمان چو تاند ایں نمود
پس چہ باشد حکمتِ رب الوجود

یعنی لقمان کی حکمت ایسا کر سکتی ہے (مخفی راز کو ظاہر کر سکتی ہے) تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کھوٹے کھرے کو الگ کرنے میں کیا کچھ کر سکتی ہے۔

حضرت لقمان کی اپنے آقا سے بے مثال وفاداری

حضرت لقمان اگر چہ ایک شخص کے غلام تھے لیکن خدا کی یاد سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ ان کا آقا ان کے مرتبہ سے واقف ہو گیا تھا اور ان کا دل سے احترام کرتا تھا۔ وہ تو ان کو کبھی کا آزاد کر دیتا لیکن حضرت لقمان غلام کے لباس میں ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے وہ ان کی منشاء کے بغیر کوئی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس کو ان سے اس درجہ محبت و عقیدت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ پہلے کھانا حضرت لقمان کے پاس بھیجتا تھا اور وہ جو کچھ بچا کر واپس بھیجتے تھے اس کو کھا کر خوش ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اس کو کسی نے ایک خربوزہ تحفہ میں بھیجا۔ مالک نے لقمان کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئے اور مالک کے سامنے بیٹھ گئے تو مالک نے خربوزے سے ایک قاش کاٹ کر لقمان کو دی، انھوں نے بڑے شوق و رغبت سے یہ قاش کھائی۔ مالک ان کو اس طرح کھاتے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دوسری قاش دی۔ وہ بھی انھوں نے شوق سے کھالی۔ یہاں تک کہ اسی طرح وہ مالک کے ہاتھ سے سترہ قاشیں لے کر کھا گئے۔ ان کے کھانے کا یہ انداز تھا کہ دیکھنے والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اب صرف ایک قاش باقی رہ گئی تھی، مالک نے کہا کہ اس کو میں کھاؤں گا۔ جونہی اس نے یہ قاش منہ میں ڈالی اس کی کڑواہٹ نے اس کے منہ میں آبلے ڈال دیے۔ آخ تھو کرتے ہوئے

اس نے لقمان سے کہا کہ تو نے اس زہر کو کیوں اس رغبت سے کھایا اور اپنی جان کا دشمن بنا۔ اگر تو اس کے کھانے میں کوئی عذر کر دیتا تو کیا حرج تھا؟ لقمان نے جواب دیا کہ میں نے تیرے خوانِ نعمت سے اس قدر نعمتیں کھائی ہیں کہ اس کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔ اب مجھ کو شرم آئی کہ ایک کڑوی شے تیرے ہاتھوں سے نہ کھاؤں۔ میرا گوشت پوستن تیری ہی بخشش سے بنا ہے۔ اگر میں ایک تلخ چیز پر واویلا کرنے لگوں تو میرے سر پر خاک۔

سیدنا مسیح علیہ السلام کا نادان ہمسفر

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایک بے وقوف آدمی بھی سفر کر رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک گہرے گڑھے میں کچھ ہڈیاں دیکھیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ جس اسمِ مبارک کی برکت سے مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں ذرا وہ اسمِ پاک مجھے بھی سکھا دیں تا کہ میں ان ہڈیوں میں جان ڈال دوں۔

حضرت عیسیٰؑ نے کہا چپ رہ یہ تیرا کام نہیں ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے بڑی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ یہ قوت تو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک عمر روح کی آلودگیوں کو پاک کرتے گزر جاتی ہے۔ اگر تو نے ہاتھ میں عصا پکڑ بھی لیا تو کیا ہوا۔ اس سے کام لینے کے لیے تو موسیٰ کا ہاتھ چاہیے۔

اس شخص نے کہا کہ آپ مجھ کو یہ اسرار نہیں بتاتے تو نہ سہی۔ آپ خود ہی یہ اسم پڑھ کر ہڈیوں پر پھونک دیں۔

اس شخص کے اصرار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجبور ہو گئے اور انھوں نے ہڈیوں پر نام خدا (قُمْ بِاذْنِ اللّٰہ) پڑھ دیا۔ یہ ہڈیاں آناً فاناً ایک خوفناک شیر کی صورت اختیار کر گئیں۔ یہ شیر اس شخص پر جھپٹا اور اس کو چیڑ پھاڑ کر رکھ دیا۔ حضرت عیسیٰ نے شیر سے پوچھا کہ تو نے اس کو کیوں مار ڈالا۔ اس نے کہا۔ اس لیے کہ اس نے آپ کو پریشان کر دیا تھا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ تو نے اس کا خون کیوں نہیں پیا؟ اس نے کہا کہ میری قسمت میں رزق نہ تھا۔ اگر میری اس دنیائے آب وگل میں روزی ہوتی تو میں مردوں میں کیوں داخل ہوتا۔

رسول رحمت ﷺ اپنے ایک صحابی کی عیادت فرماتے ہیں

رسول اکرم ﷺ کے ایک صحابی سخت بیمار ہو گئے اور شدت ضعف و نقاہت کی وجہ سے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ حضور اکرم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ اس کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ انھوں نے جب حضورؐ کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور عرض کی یارسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان یہ کتنا مبارک مرض ہے کہ اس کی بدولت میرے غریب خانے کو صبح سویرے شاہِ دو عالمؐ کے پائے اقدس چومنے کی سعادت میسر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان اور شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس بڑھاپے میں ایسی بیماری میں مبتلا کیا کہ میرے آقا و مولا کا دریائے رحمت جوش میں آ گیا۔

حضورؐ نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے کوئی نامناسب دعا مانگی جو بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگئی۔ ذرا یاد کر تو نے کیا دعا مانگی تھی۔ صحابی نے عرض کی یارسول اللہؐ دعا تو میں نے ضرور مانگی تھی لیکن اس وقت وہ میرے ذہن سے اتر گئی ہے حضورؐ دعا فرمائیں کہ مجھے یاد آ جائے۔

سرورِ دو عالم نے ان کے حق میں دستِ دعا پھیلا دیے۔ معاً ان کو وہ دعا یاد آ گئی اور انھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہؐ مجھ کو اپنی دعا یاد آ گئی ہے۔ میں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی تھی کہ الٰہی میرے گناہوں کا جو عذاب تو نے مجھے آخرت میں دینا ہے وہ مجھے اسی دنیائے

آب وگل میں دے دے۔ یہ دعا میں نے بار بار مانگی یہاں تک کہ بیمار ہو گیا۔ یہ بیماری اس قدر بڑھی کہ میں سوکھ کر کانٹا ہو گیا اور عبادت وذکر الٰہی کرنے سے بھی معذور ہو گیا اور برے بھلے اپنے بیگانے سب فراموش ہو گئے۔ اگر آپ کا رُوئے اقدس نہ دیکھتا تو بس میرا کام تمام ہو چکا تھا۔ آپؐ کے لطف وکرم اور غم خواری نے مجھ کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا: خبردار ایسی دعا پھر کبھی نہ کرنا۔ انسان تو ایک کمزور چیونٹی کی مانند ہے اس میں یہ طاقت کہاں کہ آزمائش کا اتنا بڑا پہاڑ اٹھا سکے۔

صحابیؓ نے عرض کی اے شاہ دو عالمؐ! میری ہزار بار توبہ ہے کہ آئندہ کبھی ایسی بات زبان پر لاؤں۔ حضورؐ آپ آئندہ کے لیے میری رہنمائی فرمائیں۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تو حق تعالیٰ سے ہمیشہ یہ دعا مانگا کر کہ اے خدا مجھ کو دنیا اور آخرت میں نیکی عطا فرما اور میرے راستے کی مشکلوں کو آسان کر دے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے پناہ مانگنی چاہیے۔

عقاب اور رسول کریم ﷺ کا موزۂ مبارک

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو سے فارغ ہونے کے بعد موزہ پہننے لگے کہ ایک عقاب جھپٹا اور موزہ اٹھا کر ہوا میں بلند ہو گیا جونہی اس نے موزے کو الٹایا اس میں سے ایک کالا سانپ نکل کر زمین پر گر گیا۔ پھر وہ عقاب اس موزے کو واپس لایا اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ میں نے یہ گستاخی مجبور ہو کر کی تھی۔ اب آپ اسے پہن کر اطمینان سے نماز ادا فرمائیے۔

رسول اکرمؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ ہم نے سمجھا تھا کہ اس عقاب نے زیادتی کی ہے لیکن فی الحقیقت اس نے خیر خواہی کی ہے۔ پھر آپؐ نے عقاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تو نے میری غمخواری کی تھی لیکن تیری حرکت مجھ کو ناگوار گزری۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ ہم کو غیب کی خبریں دے دیتا ہے لیکن اس وقت ہمارا دل اپنے آپ میں مشغول تھا۔

عقاب نے عرض کی: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا نہ کرے کہ آپؐ سے غفلت سرزد ہو۔ میرا موزے میں سانپ دیکھ لینا محض آپؐ کے نور اور برکت کی بدولت تھا ورنہ میری کیا بساط تھی کہ اتنی بلندی سے موزے میں پوشیدہ سانپ کو دیکھ لیتا۔ اے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپؐ ہی کا عکس ہے۔ نور کا عکس بھی نورانی ہوتا ہے اور تاریکی کا عکس تاریک ہوتا ہے۔

سیدنا موسیٰؑ سے ایک شخص کی جانوروں کی زبان سیکھنے کی درخواست

ایک نو جوان آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی کہ اے کلیم اللہ مجھ کو جانوروں کی زبان سکھا دیجیے تا کہ میں ان کی باہمی گفتگو سے عبرت حاصل کروں جب میں دیکھتا ہوں کہ بنی آدم کی ساری بولیوں کا محور تو روٹی، پانی اور حرص وہوا ہی ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہ حیوانات کی سوچ بچار کا انداز یقیناً کچھ اور ہوگا۔ اس لیے میں ان کی زبان سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس ہوس کو چھوڑ دے کیونکہ اس میں کئی خطرات پوشیدہ ہیں تو حرف ولب کی بجائے اللہ تعالیٰ سے عبرت و بیداری مانگ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر وہ شخص رنجیدہ ہو گیا اور اپنی بات پر اصرار کرنے لگا۔ کیوں کہ قاعدہ ہے کہ جس بات سے منع کیا جائے اس کی طرف رغبت اور بڑھتی ہے۔ فرمانے لگا اے کلیم اللہ جب سے اللہ نے آپ کے سینہ کو مخزنِ انوار بنایا ہے ہر شخص نے آپ سے اپنی استعداد کے مطابق فیض حاصل کیا ہے۔ یہ بات آپ کے لطف وکرم سے بعید ہے کہ مجھ کو میرے مقصد کے حصول سے محروم کر دیں۔ آپ حق تعالیٰ کے نائب ہیں اگر آپ نے میری التجا قبول نہ فرمائی تو مجھ کو سخت مایوسی ہوگئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص پر

شیطان غالب ہوگیا ہے۔اگر میں اس کی خواہش پوری کردوں تو اس کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے اور اگر نہ سکھاؤں تو یہ مایوس اور بددل ہوجائے گا۔

حکم ہوا کہ اے موسیٰؑ تم اس کو حیوانات کی بولی سکھادو۔ہم کریم ہیں اور کسی کی دعا رد نہیں کرتے۔

حضرت موسیٰؑ نے عرض کی بار الٰہا یہ شخص پچھتائے گا اور اپنے ہاتھ چبائے گا اور کپڑے پھاڑ ڈالے گا۔یہ نہیں جانتا کہ اس کے لیے کون سی چیز بہتر ہے اور کیا مضر۔

بارگاہ الٰہی سے پھر حکم ہوا کہ اے موسیٰؑ اس شخص کی تمنا پوری کردے تاکہ اس کے دل میں حسرت نہ رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اب اس نوجوان کو بڑی نرمی اور محبت سے سمجھایا کہ بھائی میں تیری مراد پوری کردوں گا لیکن اچھی طرح سمجھ لے کہ تو شیطان کے بہکاوے میں آگیا ہے اور جانوروں کی بولیاں سیکھنے سے تجھ کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔تو اپنے حال پر رحم کر اور اس سودائے خام سے باز آجا۔ایسا دردِ سر تو کیوں خوامخواہ مول لیتا ہے جو تجھ کو سو مصیبتوں میں پھنسادے۔

اس نوجوان نے کہا اچھا سارے جانوروں کی زبان نہ سہی صرف کتے کی بولی جو میرے گھر کے دروازے پر رہتا ہے اور مرغ کی بولی جو میرے گھر میں پلا ہے سکھادیجیے۔ فی الحال یہی کافی ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اچھا اب زیادہ متردّد نہ ہو۔جا آج سے ان دونوں جانوروں کی بولی پر تجھ کو قدرت حاصل ہوگئی۔وہ شخص یہ سن کر خوش خوش اپنے گھر کو لوٹا۔صبح ہوئی تو وہ آزمائش کے لیے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔خادمہ نے دسترخوان جو جھاڑا تو اس میں سے رات کا بچا ہوا روٹی کا ایک ٹکڑا زمین پر گر پڑا۔مرغ وہ ٹکڑا فوراً اچک لے گیا۔کتے نے اس سے کہا تو نے مجھ پر ظلم کیا ہے دوست۔تو تو گندم کا دانہ بھی چگ کر اپنا پیٹ بھر سکتا

ہے اور میں دانے دنکے کی بجائے روٹی کے ٹکڑوں ہی سے اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتا ہوں۔لیکن تو نے وہ بھی مجھ سے چھین لیا ہے۔

مرغ نے کہا کہ میاں صبر کرو اور غم نہ کھاؤ۔خدا تجھ کو بھی اس کا عوض دے دے گا۔کل ہمارے مالک کا گھوڑا مر جائے گا۔تم پیٹ بھر کر کھائیو۔گھوڑے کا مرنا کتوں کی عید ہے۔ اس طرح ان کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے افراط سے رزق میسر آتا ہے۔

نوجوان نے دونوں جانوروں کی گفتگو سنی تو فوراً گھوڑا تھان سے کھولا اور منڈی میں جا کر بیچ دیا۔دوسرے دن دستر خوان بچھا تو مرغ پھر روٹی کا ٹکڑا لے گیا۔کتے نے جھنجھلا کر مرغ سے کہا کہ اے فریبی یہ دروغ گوئی کب تک چلے گی تو سخت ظالم اور جھوٹا ہے تو نے کل کہا تھا کہ مالک کا گھوڑا مر جائے گا لیکن مجھ کو تو وہ مرا ہوا گھوڑا کہیں نظر نہیں آتا۔ارے اندھے نجومی تو سچائی سے محروم ہے۔

باخبر مرغ نے کہا کہ وہ گھوڑا دوسری جگہ مر گیا۔مالک نے نقصان سے بچنے کے لیے گھوڑا بیچ ڈالا اور اپنا نقصان دوسروں پر ڈال دیا۔لیکن کل اس کا اونٹ مر جائے گا اور کتے خوب مزے اڑائیں گے۔یہ سن کر مالک جھٹ پٹ اونٹ بھی بیچ آیا۔اور اس طرح اس کے مرنے کے غم اور نقصان سے اپنی جان بچالی۔

تیسرے دن پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو کتے نے مرغ سے کہا اے کمبخت تو تو جھوٹوں کا بادشاہ ہے۔آخر تو کب تک مجھے فریب دیتا جائے گا۔

مرغ نے کہا بھائی اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مالک نے عجلت کے ساتھ اونٹ کو بیچ ڈالا اور نقصان سے بچ گیا لیکن کل اس کا غلام مر جائے گا اور اس کے اقربا حاجت مندوں کو روٹیاں دیں گے اور کتوں کو بھی ڈالیں گے۔

مالک نے یہ سنا تو اسی وقت غلام کو بھی بیچ ڈالا اور نقصان سے بچ گیا۔وہ اپنی ہوشیاری پر بے حد خوش تھا اور بار بار اللہ کا شکر ادا کرتا تھا کہ میں یکے بعد دیگرے تین حادثوں

سے بچ گیا ہوں۔ جب سے میں نے مرغ اور کتے کی زبان سیکھی ہے۔ قضاء وقدر کا رخ پھیر دیا ہے۔

چوتھے دن اس محرم کتے نے مرغ سے کہا کہ اے یاوہ گو مرغ وہ تیری پیشین گوئیاں کیا ہوئیں۔ یہ تیری مکاری اور جھوٹ کب تک چلے گا۔

مرغ نے کہا توبہ توبہ یہ غیر ممکن ہے کہ میں یا میرا کوئی ہم جنس جھوٹ بولے، ہماری قوم تو مؤذن کی طرح راست گو ہے۔ ہم اگر غلطی سے بے وقت اذان دے بیٹھیں تو مارے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ غلام خریدار کے پاس جا کر مر گیا اور خریدار کا نقصان ہوا۔ مالک نے اپنا مال تو بچا لیا لیکن سمجھ لو کہ اس نے اپنا خون کر لیا۔ ایک نقصان سو نقصان کو دفع کرتا ہے۔ جسم اور مال کا نقصان جان کا صدقہ بن جاتا ہے۔ بادشاہوں کی عدالت سے سزا ملے تو مال کا جرمانہ ادا کر کے جان بچ جاتی ہے لیکن قضائے الٰہی کے بھید سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی جو آدمی اپنا مال بچاتا ہے وہ محض نادان ہے۔ اگر وہی مال اس پر سے صدقے ہو جاتا تو شاید اس سے بلاٹل جاتی۔ اب کل یقیناً خود مالک مر جائے گا اور اس کے وارث اس کی وفات پر گائے ذبح کریں گے۔ بس پھر تمھارے وارے نیارے ہیں۔ گائے کا گوشت، پتلی پتلی روٹیاں اور انواع واقسام کے لذیذ کھانے فقیروں اور کتوں کو افراط سے ملیں گے۔ گھوڑے، اونٹ اور غلام کی موت اس نادان کی جان کا صدقہ تھا۔ وہ مال کے نقصان سے تو بچ گیا لیکن اپنی جان گنوا بیٹھا:

این ریاضتہائے درویشاں چراست
کاں بلا برتن بقائے جانہانیست

(درویشوں کی یہ ریاضتیں کس لیے ہیں۔ اس لیے کہ جسم تکلیف اٹھالے لیکن جان بچ جائے)۔

مالک مرغ کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ جب اس نے اپنی موت کی پیشین گوئی سنی تو مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگا۔ گرتا پڑتا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا

اور روتے ہوئے عرض کی کہ اے موسیٰ علیہ السلام میری دستگیری فرمائیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جا اب اپنے آپ کو بھی بیچ ڈال اور نقصان سے بچ جا۔ تجھ کو ایسی خرید و فروخت میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ دوسرے لوگ مریں یا جئیں تو اپنے کیسوں اور تھیلیوں کو مال وزر سے بھر لے۔ یہ امرِ شدنی جواب تجھ کو نظر آیا ہے مجھ کو پہلے ہی اس کا علم تھا:

عاقل اول بیند آخر رابدل　　　اندر آخر بیند از دانش مقل

(آنے والی مصیبت کو دانا پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں لیکن احمق اس کو آخر میں دیکھتا ہے)

نوجوان نے پھر رو کر کہا کہ اے کریم النفس ____ مجھ کو پھٹکار کر مایوس نہ فرمائیے میں نالائق اور احمق ہی تو تھا جو مجھ سے ایسی لغزش ہوئی۔ آپ میری بری حرکت کا اچھا بدلہ دیجئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بیٹے اب تیر کمان سے نکل چکا ہے اور اس کا لوٹ کر آنا فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ مرتے وقت تجھ کو ایمان نصیب کرے:

چونکہ　ایماں　بردہ　باشی　زندہ

چونکہ　باایماں　روی　پائندہ

(اگر تو ایمان ساتھ لے جائے تو حقیقت میں زندہ ہے۔ اگر تو ایمان کے ساتھ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو تو ہمیشہ زندہ رہے گا)۔

نوجوان نے لجاجت سے عرض کی تو پھر ایسا ہی عرض کر دیجئے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اپنی جڑ کاٹی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دعا میں ضرور مانگوں گا۔

یہ سن کر اس شخص کی طبیعت دفعتاً بگڑ گئی اور وہ قے کرنے لگا۔ یہ قے ہیضے کی نہ تھی بلکہ موت کی تھی۔ چار آدمی اس کو چارپائی پر ڈال کر گھر لے گئے جہاں اس نے جان دے

دی۔ دوسرے دن صبح کو حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اے مالکِ کون ومکاں اس کو ایمان سے محروم نہ فرما تو اپنی بادشاہی کے صدقے میں اس کو بخش دے۔ اس نے یہ گستاخیاں سہو سے کیں۔ میں نے اس کو بہتیرا سمجھایا کہ تو اس علم کے سیکھنے کا اہل نہیں ہے لیکن وہ سمجھا کہ میں اسے ٹال رہا ہوں۔

حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی دعا کو قبول فرمالیا۔ غیب سے آواز آئی کہ اے موسیٰ ہم نے اس کو ایمان بخشا۔ اگر تم چاہو تو اس کو زندہ کر دیں بلکہ سب مرے ہوؤں کو زندہ کر دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کہ بارالٰہا یہ دنیا تو فانی ہے۔ اس دارِفنا میں چند دنوں کے لیے لوٹ آنے کا کیا فائدہ۔ ہاں تو ان سب پر اپنی رحمت کر اور ان کو بخش دے۔

حاصلِ کلام یہ کہ انسان کو نہ کسی بیماری میں مایوس ہونا چاہیے اور نہ مالی نقصان پر زیادہ غم کرنا چاہیے۔ ہر بیماری اور نقصان میں کوئی بھید ہوتا ہے، جسم کی مصیبت یا مال کا نقصان کسی بڑی مصیبت کا صدقہ بن جاتا ہے اور اس کو ٹال دیتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کے دربار میں مچھر کی فریاد

ایک دفعہ مچھر نے حضرت سلیمانؑ کے دربار میں فریاد کی اے سلیمانِ عادل آپ انسان وحیوان، مرغ و ماہی، جن و پری سب کا انصاف کرتے ہیں۔ ہماری دادرسی بھی فرمایئے، ہم سخت مصیبت میں گرفتار ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کہ اے دادخواہ تو کس سے انصاف چاہتا ہے۔ وہ کون سے ظالم ہیں جنھوں نے تجھ کو تکلیف دی۔ ہمارے عہد میں بھلا کون سا ظالم ہے جو اس طرح کھلے بندوں ظلم کر رہا ہے۔ ہم نے تو جس دن عنانِ حکومت سنبھالی تھی اسی دن ظلم کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ تمام ظالم اور شریر ہماری چاکری کر رہے ہیں یا زنجیروں میں جکڑے ہوئے پڑے ہیں۔ ہم کو یہ ملک حق تعالیٰ نے اس لیے دیا ہے کہ ہم دیکھیں کہ کسی مظلوم کی آہ کا دھواں آسمان پر نہ پہنچے اور نہ کسی یتیم کی آہ سے عرشِ الٰہی کانپے۔ تو کسی جھجک کے بغیر بتا کہ کس نے تجھ پر ستم روا رکھا ہے۔

مچھر نے کہا ''اے بادشاہ ہمارا گلہ ''ہوا'' سے ہے، اس نے ہم کو اس قدر تنگ کیا ہے کہ رات دن ہم خون کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں۔ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے اور ظالم کے خلاف اپنی فریاد آپ کے پاس لانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آپ بڑے منصف اور عادل ہیں۔ خدا کے لیے ہمارا انصاف کیجئے۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ اے سریلی راگنی والے حق نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ ایک فریق کا بیان سن کر فیصلہ نہ کر دیا کروں۔ بلکہ دونوں فریقوں کو اپنے سامنے بلاؤں اور ان کے بیانات سن کر جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کروں۔

اکیلا مدعی خواہ ہزار واویلا مچائے مدعا علیہ کی بات سنے بغیر اس کی باتوں کو قبول نہ کروں۔ میں اللہ کے حکم سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ جا اور اپنے دشمن کو میرے پاس لے آ۔

مچھر نے فرمایا کہ آپ نے درست فرمایا۔ لیکن میری دشمن ہوا ہے اور وہ آپ کی تابع فرمان ہے۔

یہ سُن کر حضرت سلیمانؑ نے ہوا کو آواز دی کہ اے ہوا مچھر نے تیرے خلاف شکایت کی ہے تو اس کے سامنے آ کر اپنی صفائی پیش کر۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا حکم سنتے ہی ہوا سنسناتی ہوئی آ گئی۔ اس کے پہنچنے کی دیر تھی کہ مچھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کو للکارا کہ اے مچھر کہاں جاتا ہے۔ ٹھہر تا کہ میں تم دونوں کا بیان لے کر فیصلہ کردوں۔

مچھر نے عرض کی کہ اے بادشاہ ہوا کا آنا میری موت کا پیغام ہے۔ اسی نے تو میری زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے۔ جب ہوا آ جائے تو میرا ٹھہرنا ناممکن ہے کیونکہ ہوا کے چلنے سے میری جان ہوا ہوتی ہے۔

دوستو یہی حال خدا کی درگاہ کو ڈھونڈنے والے کا ہے۔ جب خدا اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو ڈھونڈنے والا فنا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وصل حق فی الحقیقت حیاتِ ابدی ہے لیکن اس حیات ابدی کا آغاز فنا ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

سیدنا نوح علیہ السلام کا نافرمان بیٹا

جب طوفانِ نوح کا ظہور ہوا تو حضرت نوح علیہ السلام نے کنعان سے فرمایا کہ آ اور کشتی میں بیٹھ جا تا کہ غرق نہ ہو جائے۔

کنعان نے کہا: ''مجھے تیرنا آتا ہے اور مجھے تیری کشتی کی حاجت نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ بڑا ہولناک طوفان ہے اس میں تیری تیراکی کام نہ آئے گی۔

کنعان نے کہا کچھ پروا نہیں میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا جو ہر بلا سے محفوظ ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ''ایسا مت کرنا کیونکہ اس وقت پہاڑ بھی ایک تنکے کے برابر ہے اور اللہ کے دوستوں کے سوا کسی کو پناہ نہ دے گا۔

کنعان نے کہا: ''میں نے اس سے پہلے تیری نصیحت کب سنی تھی جو اب تو یہ امید رکھتا ہے کہ میں تیری بات مانوں گا۔ مجھ کو تیری بات بالکل پسند نہیں ہے، میرا دونوں جہاں میں تیرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔''

حضرت نوحؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''بیٹے آج کا دن اکڑنے کا نہیں ہے اس نازک گھڑی میں بارگاہ الٰہی میں ناز دکھانا خطا ہے۔'' :

کنعان نے کہا: ''تم ایسی باتیں سالہا سال سے کر رہے ہو۔ اب پھر ان کی تکرار کاہے کو کر رہے ہو۔ ہر شخص نے تمھاری باتوں کا سرد مہری سے جواب دیا۔ اب میں خاصہ عقل مند ہوں۔ اس لیے تمھاری سرد آہوں سے مجھ کو دکھ ہوتا ہے ان باتوں کو چھوڑ دو۔

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: ''اے بیٹے ایک بار تو باپ کا کہنا مان لے۔آخر اس میں تیرا نقصان ہی کیا ہے؟

غرض حضرت نوح علیہ السلام اس کو بار بار نصیحت کرتے رہے لیکن وہ ہر بار سخت سے سخت جواب دیتا۔نہ باپ نصیحت کرنے سے تھکے اور نہ بد بخت بیٹے نے کوئی بات سُنی۔

باپ بیٹے میں یہی سوال و جواب ہو رہے تھے کہ ایک تند و تیز موج آئی اور کنعان کو بہا کر لے گئی۔

نوح علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کی کہ الٰہی تو نے مجھ سے بار ہا وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل ،طوفان سے بچے رہیں گے۔تیرے وعدے سے میں مطمئن تھا لیکن اب طوفانی موجیں میری کملی کو بہا کر لے گئی ہیں۔بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ وہ گم کردہ راہ تیرے اہل خویش میں سے نہ تھا۔تو نے خود سفید اور نیلے میں تمیز نہیں کی۔جب تیرے دانتوں کو کیڑا لگ جائے تو وہ دانت کب رہتے ہیں ان کو اکھڑوانے میں ہی تیری بھلائی ہے تاکہ تیرا باقی جسم ان کرم خوردہ دانتوں کی وجہ سے تکلیف میں نہ مبتلا ہو جائے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی الٰہی میں تیرے غیر سے بیزار ہوں اور وہ کون غیر ہے جو تجھ سے ہارا نہ ہو۔

حکم ہوا کہ اے نوحؑ اگر تو چاہے تو ابھی تیرے سامنے سب مردوں کو زندہ کر دوں۔ایک کنعان کے لیے میں تیرا دل نہیں توڑوں گا۔لیکن ذرا تجھ کو اس کے احوال سے آگاہ کرتا ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی کہ نہیں نہیں میں تو اس بات پر بھی راضی ہوں کہ اگر تو چاہے تو مجھے بھی غرق کر دے کہ تیرے حکم سے میری موت میرے لیے زندگی ہے۔

انبیائے عظام اور گلہ بانی

ایک دفعہ ایک بھیڑ حضرت موسیٰ کلیم اللہ سے ڈر کر بھاگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑنا چاہا تو وہ اور تیز بھاگی اس کا تعاقب کرتے کرتے کلیم اللہ کے جوتے ٹوٹ گئے اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ آپ شام تک اس کو تلاش کرتے رہے۔ آخر بھاگتے بھاگتے بھیڑ تھک گئی اور ایک جگہ کھڑی ہو کر ہانپنے لگی۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس تک پہنچ گئے۔ آپ نے اس کی گردن جھاڑی اور ایک مادر مہربان کی طرح شفقت سے اس کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اتنی تھکا دینے والی دوڑ دھوپ کا آپ کے دل میں ذرا بھی ملال نہ تھا۔ اس کے برعکس اس بھیڑ کی تکان پر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور آپ نے اس سے فرمایا کہ تجھے مجھ پر رحم نہ آیا لیکن یہ تو بتا کہ بھاگ بھاگ کر تو نے اپنی جان کیوں ہلکان کی اور اس قدر تکلیف اٹھائی۔

اس وقت حق تعالیٰ نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ دیکھو اسی شخصیت کو نبوت زیبا ہے۔ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر نبی خواہ بچہ ہو یا جوان اس کا گلہ بانی کرنا ضروری ہے۔ انبیاء کو گلہ بانی کرانے سے حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ ان میں وقار اور صبر پیدا ہو۔

سیدنا فاروقِ اعظمؓ اور قیصرِ روم کا ایلچی

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ قیصر روم نے اپنا سفیر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ خلیفہ کا محل کہاں ہے تاکہ میں وہاں اپنا گھوڑا اور اسباب پہنچاؤں۔ لوگوں نے کہا کہ ہمارے خلیفہ کا کوئی محل نہیں ہے۔ گو ان کی حکومت کا ڈنکا ساری دنیا میں بج رہا ہے لیکن وہ خود درویشوں کی طرح معمولی جھونپڑی میں رہتے ہیں، اگر تجھے ان کا مقام دیکھنے کی آرزو ہے تو پہلے اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کے وسوسوں اور جذبات سے پاک کر لے۔

سفیر نے جب اہل مدینہ سے اس قسم کی باتیں سنیں تو اس کے دل میں خلیفہ سے ملنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس نے گھوڑا اور اسباب وہیں چھوڑا اور خود حضرت عمر فاروقؓ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ پھرتے پھرتے اس کا گزر ایک اعرابی خاتون کے پاس سے ہوا۔ اس سے خلیفہ کا پتا پوچھا تو اس نے کہا کہ عمر کھجور کے اس درخت کے نیچے یکہ و تنہا سو رہے ہیں۔ سفیر ادھر بڑھا۔ جب اس کی نظر حضرت عمرؓ پر پڑی تو ان کی ہیبت سے اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اگرچہ محبت اور ہیبت ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ یہ دونوں ضدیں اس کے دل میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس نے جی میں کہا کہ میں نے بہتیرے بادشاہ دیکھے ہیں اور ان کی صحبتوں میں رہا ہوں لیکن آج تک مجھے کسی بادشاہ سے خوف محسوس نہیں ہوا۔ معلوم نہیں اس شخص کی (حضرت عمرؓ) کی ہیبت سے میرے اوسان کیوں خطا ہو گئے ہیں۔ میں شیروں اور چیتوں سے بھرے ہوئے جنگلوں میں بھی پھرتا رہا

ہوں لیکن میرے چہرے پر خوف کی زردی کبھی نہیں چھائی۔ میں نے بارہا جنگوں میں حصہ لیا ہے اور شیروں کی طرح لڑ کر دنیا پر اپنی شجاعت کا سکہ بٹھایا ہے۔ حریف کو زخم لگائے بھی ہیں اور اس سے زخم کھائے بھی ہیں لیکن میرے دل نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی کمزوری نہیں دکھائی۔ لیکن آج معلوم نہیں کہ کیا بات ہے کہ اس سوئے ہوئے نہتے آدمی کو دیکھ کر میرے جسم کی بوٹی بوٹی کپکپا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حق کی ہیبت ہے۔ اس گدڑی پوش آدمی کی نہیں:

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

یعنی حق سے ڈر کر جس نے تقویٰ (پرہیزگاری) کی راہ اختیار کی، اس سے جن وانس اور ہر شے ڈرتی ہے۔

وہ دل ہی دل میں ایسی باتیں کر رہا تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھ کھل گئی۔ سفیر نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے نہایت شفقت سے سلام کا جواب دیا۔ سفیر کو اپنے پاس بٹھا کر تسلی دی اور دیر تک اس کے ساتھ معرفت کی باتیں کرتے رہے سفیر آپ کے اخلاق حسنہ اور سادگی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے دل سے کفر و شرک کا زنگ یکسر دور ہو گیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اخلاصِ عمل

از علیؓ آموز اخلاص عمل
شیر حق راداں منزہ از دغل

(حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عمل کا اخلاص سیکھو۔ اس اللہ کے شیر کو نفسیات سے پاک سمجھو)۔

ایک لڑائی (جہاد) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک جنگجو کافر کو زیر کرلیا اور پھر تلوار سے اس کی گردن کاٹنے کا اردہ کیا۔ نیچے پڑے ہوئے کافر نے آپ کے روئے مبارک پر تھوک دیا۔ اس پر شیر خدا نے تلوار ہاتھ سے ڈال دی اور کافر کو چھوڑ دیا۔ وہ کافر آپ کا رد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور پوچھا یہ عفو درگزر کا کیا موقع ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میری تجھ سے لڑائی صرف اللہ کی خاطر تھی لیکن تو نے میرے منہ پر تھوک کر مجھے غصہ دلایا اور میرے دل میں ذاتی انتقام کی خواہش پیدا ہوگئی۔ یوں لڑائی کا مقصد نصف خدا کے لیے اور نصف اپنی ذات کے لیے ہوگیا چونکہ میری ذات اور تلوار ہر شے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے وقف ہے۔ اس لیے میں نے تمھیں چھوڑ دیا۔

اس کافر نے شیر خدا کی یہ تقریر سنی تو اس کے دل سے کفر وشکر کی نجاست دور ہوگئی اور وہ مسلمان ہوگیا۔ اسے دیکھ کر اس کے بہت سے رشتہ دار اور اہلِ قوم بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل زصد لشکر ظفر انگیز تر

حلم کی تلوار لوہے کی تلوار سے زیادہ تیز بلکہ فتح وکامرانی میں سو لشکروں سے بڑھ کر ہے۔

حضرت ذوالنّون مصریؒ کی حالتِ دیوانگی اوراحباب کی مزاج پُرسی

(مشہور ولی اللہ) حضرت ذوالنون مصریؒ کوایک دفعہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ عشق الٰہی کے جنون میں وہ اپنے آپے میں نہ رہے اور دنیا دار علماء ومشائخ پر برسرعام اس جوش و خروش سے تنقید شروع کر دی کہ ان کو سننے کی تاب نہ رہی اور ملک میں فساد اور شورش کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس وقت حکومت نااہلوں کے ہاتھ میں تھی جو ذوالنون کے بلند مرتبہ سے آگاہ نہ تھے۔ انھوں نے آپ کو گرفتار کر کے قید خانے میں بھیج دیا:

چوں سفیہاں را بود کار کیا
لازم آمد یَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَاء

(جب نااہلوں کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور آجاتی ہے تو وہ انبیاء تک کو قتل کر ڈالتے ہیں)۔

غرض حضرت ذوالنون جب پابند سلاسل ہو کر قید خانے میں پہنچے تو ان کے معتقدین حضرت کی مزاج پرسی کے لیے قید خانے کی طرف روانہ ہوئے اور ان کے جنون اور آتش بیانی کے بارے میں رائے زنی کرنے لگے۔ ان میں سے سبھی کا یہ خیال تھا کہ حضرت کے بے مثل علم وفضل کے پیش نظر اس بات پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے عقل و دانش کے ماہِ درخشاں کو بیماری کا ابر چھپا لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر دیوانے بن گئے ہیں

اور عام لوگوں کے شر سے بچنے کے لیے قید خانے چلے گئے ہیں۔ دراصل وہ اس ننگ سے بچنا چاہتے ہیں کہ ان کو اس زمانہ کے نام نہاد داناؤں میں شمار کیا جائے۔ جب وہ لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے ذوالنون کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر للکارے کہ خبردار تم کون لوگ ہو جو میری طرف بے تحاشا بڑھ رہے ہو۔ یہاں سے دور ہو جاؤ۔

انھوں نے بڑے ادب سے عرض کی ہم سب آپ کے عقیدت مند ہیں اور دلی خلوص کے ساتھ آپ کی پرسشِ احوال کے لیے آئے ہیں۔ اے عقل و حکمت کے بحرِ زخار آپ کا کیا حال ہے اور آپ کی عقل پر یہ جنون کی تہمت کیسی لگائی جا رہی ہے۔ اس میں جو راز ہے از راہ کرم اس سے ہم کو آگاہ فرمائیں۔ ہم سب آپ کے محب ہیں۔ اور آپ کی تکلیف سے ہمارے دل زخمی ہیں۔ اپنا راز اپنے سچے دوستوں سے نہ چھپایئے۔ ورنہ ہم آپ کے غم میں گھل گھل کر ہلاک ہو جائیں گے۔

جب حضرت ذوالنونؒ نے ان کی یہ باتیں سنیں تو انھوں نے دوستی اور خلوص کا دعویٰ کرنے والے ان عقیدت مندوں کو آزمانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بناوٹی جنون کے جوش میں ان کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور صرف بے نقط سنانے ہی پر اکتفانہ کیا بلکہ منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور لاٹھی پتھر جو شے ہاتھ میں آئی ان پر پھینکنے لگے۔ ان لوگوں نے حضرتؒ کی جو یہ کیفیت دیکھی تو اپنی جان بچانے کے لیے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔ ذوالنونؒ نے ان کو اس طرح بھاگتے دیکھا تو قہقہے لگانے لگے اور پھر سر ہلا کر فرمایا کہ خلوص اور محبت کے ان دعویداروں کو دیکھو۔ چوٹ کے ڈر سے کیسے بھاگے جا رہے ہیں۔ حالانکہ دوست کو دوست کے ہاتھ سے جو تکلیف پہنچے اس کو وہ دل و جان سے پیاری ہوتی ہے:

دوست کے گراں گیرد ز رنجِ دوست
رنج مغز و دوستی او را چو پوست

دوست کو دوست کی طرف سے تکلیف کب ناگوار گزرتی ہے۔ یہ تکلیف ہی اصل شے (مغز) ہے اور دوستی محض اس کا چھلکا ہے۔

آزمائش اور مصیبت کی گھڑی میں راضی بہ رضا رہنا ہی سچی دوستی کی علامت ہیں دوست کی مثال سونے کی سی ہے اور مصیبت گویا آگ ہے۔ خالص سونا آگ ہی میں پڑ کر کندن بنتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ نے سلطنت کو لات ماردی

حضرت ابراھیم ادھمؒ فقر اختیار کرنے سے پہلے ایک عظیم سلطنت کے فرمانروا تھے ۔ایک دن وہ اپنی خوابگاہ میں سور ہے تھے کہ یکا یک کوٹھے پر کھٹ کھٹ اور ہائے ہو کی آواز سنی۔ وہ بیدار ہو کر سوچنے لگے کہ شاہی محل کے چاروں طرف پہرہ ہے کس کی مجال ہے کہ کوٹھے پر اس طرح کھٹ کھٹ کر رہا ہے۔ایک کھڑکی سے آواز دی کہ کون ہے۔ آدمی ہے یا پری۔

یکا یک انھوں نے دیکھا کہ چھت پر سے کچھ عجیب وغریب قسم کے لوگ نیچے جھانک رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم بڑی دیر سے تلاش کر رہے ہیں۔

ابراہیمؒ نے پوچھا۔تم کو کس کی تلاش ہے؟

بولے ہم اپنا اونٹ ڈھونڈ رہے ہیں۔

ابراہیم نے کہا ارے اونٹ کا چھت پر کیا کام؟

وہ کہنے لگے کہ اگر اونٹ چھت پر نہیں چڑھ سکتا تو تو اس شان وشوکت کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر خدا کو کیسے ڈھونڈ سکتا ہے؟

حضرت ابراہیم پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے تاج وتخت پر لات ماردی اور ہمیشہ کے لیے راہ فقر اختیار کر لی۔

سیدنا علی مرتضیٰؓ کی حکمت وفراست

ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ اے باب علم میرا شیر خوار بچہ چوڑے منہ والے پرنالے پر چڑھ گیا ہے۔ اگر اس کو اپنے حال پر چھوڑتی ہوں تو ڈر ہے کہ پرنالے کے اندر نہ جا گرے اور اگر ڈراتی ہوں تو اس کو اپنا نفع نقصان سمجھنے کا شعور نہیں ہے۔ میں نے اس کو بار بار دودھ بھی دکھایا لیکن وہ میری طرف رخ ہی نہیں کرتا۔ خدا کے لیے میری مشکل حل کیجیے۔ کہیں میں اپنے لخت جگر سے ہاتھ نہ دھو بیٹھوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اس کے کسی ہم عمر بچے کو کوٹھے پر لے جاؤ تا کہ وہ اپنے ہم جنس کو دیکھ کر اس کی طرف آجائے۔ عورت نے ایسا ہی کیا، بچے نے جب اپنے ہم جنس کو کوٹھے پر دیکھا تو خوشی سے قلقاریاں مارتا ہوا گھسٹتا گھسٹتا اس کی طرف چلا گیا اور اس طرح خطرے سے محفوظ ہو گیا۔

انبیاء بھی اس لیے آدمیوں کی جنس سے ہیں کہ ان کی ہم جنس مخلوق بدرو (گندی نالی) میں گرنے سے بچ جائے کیونکہ جنس کو جنس کی کشش ہوتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ میں تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں تو اس کی حکمت یہی ہے کہ لوگ اپنی جنس کی طرف رجوع کریں اور گمراہ نہ ہونے پائیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ایک یہودی

ایک دن ایک یہودی نے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت سے آگاہ نہ تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ آپ ایک بلند محل کے کوٹھے پر ہیں اور اللہ حفاظت کا ذمہ دار ہے۔کیا آپ کو اس کا علم ہے۔حضرت علیؓ نے فرمایاہاں وہ خالق حقیقی بچپن سے لے کر آخر تک انسان کا محافظ ہے:

یہودی نے کہا:اگر آپ کو فی الواقع اس بات کا یقین ہے تو اپنے آپ کو اس کوٹھے سے نیچے گرادیں تا کہ مجھے بھی معلوم ہو جائے کہ خدا آپ کی کیسے حفاظت کرتا ہے۔پھر میں بھی آپ کا ہم عقیدہ ہو جاؤں گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ بس خاموش رہ تا کہ تیری جان اس جرأت سے ابتلا میں نہ مبتلا ہو جائے۔بھلا بندے کی کیا ہستی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا امتحان لے۔یہ بات تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کا ہر گھڑی امتحان لے تا کہ ہم اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور ہمیں پتہ چل جائے کہ اس کے عالم غیب ہونے کے بارے میں ہمارا عقیدہ کس قدر پختہ ہے۔جب کسی انسان کے دل میں حق تعالیٰ کا امتحان لینے کا وسوسہ پیدا ہو تو یہ سراسر اس کی بدبختی ہے۔اس کو فوراً سجدہ میں گر کر بارگاہ الٰہی میں اس وسوسے سے نجات پانے کی دعا کرنی چاہیے۔

سیدنا عثمان غنیؓ کے عہدِ خلافت کی ابتداء

حضرت عثمان ذوالنورینؓ جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو وہ منبر رسولؐ کی طرف تشریف لے گئے۔ یہ منبر مبارک تین پایوں کا تھا۔ سب سے اوپر کے پائے پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروز ہوا کرتے تھے۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ منبر کے تیسرے پائے پر بیٹھتے تھے۔ ان کے بعد خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے تیسرے پائے پر بیٹھنا اختیار کیا۔ اب حضرت عثمانؓ کی باری آئی تو آپ سب سے اوپر کے پائے پر جا کر بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے اعتراض کیا کہ شیخینؓ (حضرت صدیقؓ وفاروقؓ) تو رسول اکرم ﷺ کی جگہ پر نہ بیٹھے تھے لیکن آپ نے اپنے آپ کو ان پر کیوں فوقیت دی۔

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ اگر میں تیسرے پائے پر بیٹھتا تو لوگ شک کرتے کہ یہ اپنے آپ کو عمرؓ کا ہمسر سمجھتا ہے اور اگر دوسرے پائے پر بیٹھتا تو لوگ کہتے کہ یہ ابوبکر صدیقؓ کی برابری کرتا ہے مگر یہ پہلا پایہ جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست گاہ ہے اور حضورؐ کی برابری کا کوئی تصور ہی نہیں کرسکتا۔ جب لوگوں نے حضرت عثمانؓ کا یہ جواب سنا تو ساری مجلس میں سناٹا چھا گیا۔ حضرت عثمانؓ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور عصر تک اس طرح بیٹھے رہے۔ کسی شخص کو مجال نہ تھی کہ آپ کو خطبہ پڑھنے کے لیے کہے یا مسجد سے باہر چلا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین سے آسمان تک ایک نور پھیلا ہوا ہے اور تمام خاص و عام اس نور کی ہیبت سے دم بخود تھے۔ جو لوگ بینا تھے وہ تو اس نور کو دیکھ ہی رہے تھے لیکن جو نابینا تھے وہ بھی اس کی گرمی کو محسوس کر رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے کہ ان کو بینائی مل گئی۔

سلطان محمود غزنویؒ اور چوروں کی جماعت

سلطان محمود غزنویؒ ایک دن اپنے معمول کے مطابق رات کو بھیس بدل کر گشت کر رہا تھا۔ گشت کرتے کرتے اس کو چوروں کی جماعت ملی۔ انھوں نے سلطان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟

سلطان نے کہا کہ میں بھی تمھارا ہی ایک ہم پیشہ ہوں۔ اس پر ایک چور نے کہا کہ ہم پیشہ دوستو ذرا اپنا اپنا فن تو بتاؤ۔ ہر شخص بتائے کہ اس کو کس بات میں کمال حاصل ہے۔ ان میں سے ایک بولا کہ میرے کانوں میں عجیب خوبی ہے۔ جب ان میں کتے کے بھونکنے کی آواز آتی ہے تو میں فوراً سمجھ جاتا ہو کہ وہ کیا کہتا ہے۔

دوسرے نے کہا کہ میری آنکھوں میں یہ خاصیت ہے کہ میں جب کسی کو رات کے اندھیرے میں دیکھ لیتا ہوں تو دن کو اسے بغیر کسی دقت کے پہچان لیتا ہوں۔

تیسرے نے کہا کہ میرے بازوؤں میں یہ طاقت ہے کہ وہ بغیر کسی ہتھیار کی مدد کے نقب لگا سکتے ہیں۔

چوتھے نے کہا کہ میری ناک میں یہ خاصیت ہے کہ میں کسی جگہ کی مٹی سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ کس جگہ خزانہ گڑا ہے اور اس کی مقدار کیا ہے۔

پانچویں نے کہا کہ میرے پنجے میں ایسی قوت ہے کہ خواہ کتنے ہی بلند محل پر کمند پھینکوں وہ اس کے کنگرے کو پکڑ لیتی ہے۔

پانچوں چور اپنا اپنا کمال بیان کر چکے تو وہ سلطان سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ تو

بھی اپنا کمال بیان کر۔

سلطان نے کہا کہ میری داڑھی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ مجرموں کو قید سے رہا کرا دیتی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جب ان کو قتل کے لیے جلادوں کے سپرد کیا جاتا ہے اس وقت اگر میں داڑھی ہلا دوں تو وہ سب رہا ہو جاتے ہیں۔

چوروں نے یہ سن کر نعرہ لگایا کہ تیرا کمال سب سے فائق ہے۔ اس لیے تو ہی ہمارا سردار ہے۔ ہمیں اب کسی مصیبت کا خوف نہیں کیونکہ تیرا وجود ہماری رہائی کا ضامن ہے۔

اس کے بعد سب مل کر باہر نکلے اور قصر شاہی کے قریب پہنچے۔ اتنے میں دائیں طرف سے ایک کتا بھونکا۔ پہلے چور نے کہا یہ کتا کہتا ہے کہ کوئی بادشاہ تمھارے قریب ہے۔ دوسرے چور نے مٹی سونگھ کر کہا کہ اس کے آس پاس شاہی خزانہ ہے۔ تیسرے چور نے محل کی دیوار پر کمند پھینکی اور سب اس کے سہارے دوسری طرف اتر گئے۔ اب نقب زن کی باری تھی۔ اس نے نہایت پھرتی سے نقب لگائی اور سب کو خزانہ کے اندر پہنچا دیا۔ سب نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق زر و جواہر اکٹھے کیے اور اپنی جائے پناہ میں جا کر بیٹھے گئے۔ سلطان موقع پا کر وہاں سے کھسک گیا اور دوسرے دن سپاہیوں کو اس جائے پناہ کا پتہ دے کر چوروں کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سپاہی دوڑے گئے اور سب چوروں کو آناً فاناً گرفتار کر کے لے آئے۔ جب ان کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا تو خوف سے ان کے چہرے زرد تھے اور جسم کانپ رہے تھے۔ جو چور رات کو دیکھے ہوئے آدمی کو دن میں پہچان لیتا تھا اس کی نظر جونہی سلطان کے چہرے پر پڑی اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے ہمارے رات کے ساتھی اب وقت آ گیا ہے کہ آپ اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ ہم سب تو اپنا اپنا کمال دکھا چکے ہیں لیکن ہم میں سے کسی کا کمال ہمارے کام نہ آیا۔ ہاں شاید میرا کمال کچھ کام دے جائے کہ جس کی آنکھ نے اس شاہِ ذی جاہ کو پہچان لیا ہے جو اپنی ریش مبارک ہلا کر مصیبت زدوں کو رہا کرا سکتا ہے۔

سلطان کو اس کی باتیں سُن کر رحم آ گیا اور اُس نے اپنی گردن ہلا کر حکم دیا کہ ان کو رہا کر دیا جائے:

بیں ز بدناماں نباید ننگ داشت
ہوش بر اسرار شاں باید گماشت

بدنام لوگوں سے ہمیشہ ننگ و عار نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہوشمندی کے ساتھ ان کے بھیدوں کو معلوم کرنا چاہیے۔

شیخ ابوالحسن خرقانیؒ اوران کی بیوی

طالقان کے رہنے والے ایک درویش کو شیخ ابوالحسن خرقانیؒ (متوفی ۴۲۶ھ) کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔اس نے شیخ کی شہرت مدت سے سن رکھی تھی۔لیکن راستے کی دوری اور مصیبتوں کا خیال کرتا تھا تو خرقان جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔آخر ایک دن شیخ کے شوقِ زیارت نے اس کو بے تاب کردیا اور وہ عازم خرقان ہوگیا۔ پہاڑ، جنگل، وادیاں اور دریا عبور کرتا ہوا وہ ایک طویل اور پُر صعوبت سفر کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچ گیا اور شیخ ابوالحسنؒ کا مکان ڈھونڈ کر دروازے پر دستک دی۔ایک عورت نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پوچھا کہ تم کون ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو۔درویش نے جواب دیا کہ میں فلاں شہر سے حضرت ابوالحسنؒ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

اس عورت نے بلند قہقہہ لگایا اور کہا کہ واہ میاں درویش بھلا یہ بھی کوئی مقصد تھا جس کے لیے تو نے اتنا طویل اور کٹھن سفر کیا۔معلوم ہوتا ہے کہ تو نے دھوپ میں اپنی داڑھی سفید کی ہے۔تمھاری عقل و دانش پر تو رونے کو جی چاہتا ہے۔شاید اپنے گھر پر تجھ کو کوئی کام نہ تھا جو آوارہ گردی کرتے ہوئے یہاں آگئے۔غرض ان بی بی صاحبہ نے ایسی نامناسب اور بے ہودہ باتیں کیں کہ ان کی تکرار سے بھی شرم آتی ہے۔یہ عورت شیخ ابوالحسن کی اہلیہ تھی۔ درویش اس کی باتیں سن کر بڑا پریشان ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔تاہم اس نے ہمت کر کے پوچھا کہ حقیقت حال کچھ ہی ہو یہ تو بتائیے کہ شیخ ہیں کہاں؟ عورت نے کہا کہ وہ تو ایک مکار ہے، دھوکے باز ہے، جھوٹا، بسیار خور اور ڈینگ باز شخص ہے۔اس نے

دھوکے کا جال بچھا رکھا ہے جس میں احمق پھنس کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اگر تو اس سے ملے بغیر واپس چلا جائے تو گمراہ ہونے سے بچ جائے گا۔ اس قوم کے لوگ تو اب سطحی اور گوسالہ پرست ہو گئے ہیں جو سامری کے بچھڑے جیسے ایک آدمی پر مٹے ہوئے ہیں۔ افسوس کہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کے طریقہ سے غافل ہو گئے۔ اب وہ پر خلوص نماز، روزہ اور ذکر و شغل کہاں۔ ان لوگوں نے تقویٰ اور احکامِ شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ آج تو ایک عمرؓ کی ضرورت ہے جو سختی سے ان لوگوں کا محاسبہ کرے۔

درویش کو یہ باتیں سن کر غصہ آیا اور اس نے للکار کر کہا کہ اپنی بکواس بند کر۔ شیخ کے انوارِ فیوض سے ایک دنیا جگمگا رہی ہے اور ان کی عظمت نے افلاک کی رفعتوں کو چھو لیا ہے۔ چاند پر تھوکنے والا فی الحقیقت اپنے منہ پر تھوکتا ہے۔ کتا دریا میں گر جائے تو دریا نجس نہیں ہوتا۔ آفتاب عالم تاب پر لاکھ پھونکیں مارو وہ کبھی بجھ نہیں سکتا۔ غرض درویش نے شیخ کی اہلیہ کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ پھر وہ وہاں سے نکل کر شہر کے لوگوں سے شیخ کا پتہ پوچھنے لگا۔ کسی نے کہا کہ شیخ پہاڑ سے ایندھن لانے گئے ہیں۔ درویش شیخ کی زیارت کے لیے اسی طرف چل دیا۔ راستے میں اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ ایسی مکار اور بدزبان عورت کو اپنے گھر میں کیوں رکھ چھوڑا ہے۔ شیخ اور وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پھر ان دو ضدوں میں ربط کیسے قائم ہے۔ ایسے امامِ زمانہ کا ایک شیطان کے ساتھ کیسے نباہ ہوتا ہے۔ پھر اس نے لاحول پڑھی اور سوچا کہ اس میں کوئی بھید ہوگا۔ شیخؒ کے بارے میں ایسے وسوسے دل میں لانا بہت برا ہے۔ درویش ادھیڑ بن میں جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو شیر پر سوار اس کی طرف آ رہا تھا۔ شیر کی پیٹھ پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اور لکڑیوں پر وہ شخص ہاتھ میں سانپ کا کوڑا لیے بیٹھا تھا۔ درویش سمجھ گیا یہی شیخ ابوالحسن خرقانیؒ ہیں۔ آپ نے مرید کو دور سے دیکھا اور ہنس کر فرمایا کہ نفس کی باتوں کو نہ سن۔ دراصل شیخ نے درویش کے مافی الضمیر کو پڑھ لیا تھا۔ درویش نے تمام واقعات جو اس کو پیش آئے تھے بلا کم و کاست شیخ کے گوش گزار کر دیئے۔ شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ

بلند مقام اپنی بیوی کی بدزبانی پر صبر کرنے کی وجہ سے عطا کیا ہے۔اگر میں اس کی ہرزہ سرائیاں برداشت نہ کرتا تو یہ شیر نر میرا مطیع کیسے ہوتا:

گر نہ صبرم میکشیدے بارِ زن

کے کشیدے شیر نر بیگار من

اگر میرا صبر اس عورت کا بوجھ نہ اٹھا سکتا تو پھر بھلا شیر نر میرا بوجھ کیسے اٹھاتا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور حضرت جبرائیلؑ

حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پہنچا کر اپنی طرف سے عرض کیا اے خلیل اللہ! اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں تاکہ میں بجالاؤں۔ اگر کوئی حاجت ہو تو بتائیں تاکہ اسے پورا کروں۔ اس حق آگاہ موحد خلیل اللہ نے جواب دیا کہ مجھے بلاشبہ کئی حاجتیں ہیں۔ مگر خدا کسی اور کا در نہ دکھائے۔ اے جبرائیل بتا کہ بندے کی وہ کون سی حاجت ہے جس کا خدائے مالک و رازق کو علم نہیں؟ جب وہ میری تمام ضرورتوں کو جانتا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ اپنی حاجات تجھ سے بیان کروں:

گفت ابراہیم نے رد از میاں
واسطہ زحمت بود بعد العیاں
کائل حروف واسطہ اے یار غار
پیش واصل خار باشد خارخار

جو ماسوائے اللہ کے ناطہ توڑ کر صرف اللہ سے لو لگالیتا ہے اسے کسی کی پروانہیں رہتی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ایک بوڑھا

از کہ بگریزیم از خود ایں محال
از کہ برتابیم از حق ایں وبال

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ السلام کے پاس ایک بوڑھا آدمی ہانپتا کانپتا ہوا آیا۔ خوف سے اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا اور ہونٹ نیلے۔ حضرت سلیمانؑ نے پوچھا یہ تیرے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں ۔ تجھے کس نے اس قدر خوف زدہ کردیا ہے اس نے عرض کی: یا حضرت! مجھے آج ملک الموت نظر آیا ہے۔ اس کی مہیب صورت سے میں اس قدر خائف ہوا کہ رنگ فق ہوگیا۔ خدا نے جنات اور ہوا کو آپ کے تابع کیا ہوا ہے۔ براہ کرم مجھے یہاں سے دور ہندوستان میں پہنچانے کا انتظام کردیں تاکہ میری جان میں جان آئے اور مجھ سے عزرائیل کا ڈر دور ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا اور وہ شخص اسی دن ہندوستان پہنچ گیا۔ دوسرے دن صبح کو جب سلیمانی دربار لگا تو حضرت عزرائیل بھی حاضر ہوئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس خوف زدہ شخص کا حال پوچھا ملک الموت نے عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس شخص کا ہندوستان میں کل ہی مرنا مقدر تھا۔ میں نے جب اس کو یہاں پایا تو تعجب سے اس کی طرف غور سے دیکھا اور سمجھا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ موت کا فرشتہ دیکھ کر اس کا پریشان ہونا قدرتی امر تھا۔ پس وہ آپ کے پاس آیا کہ آپ اسے ہندوستان پہنچادیں تاکہ اس کا خوف و ہراس دور ہوجائے۔ اس نے بزعم خود موت سے بچنے کی تدبیر کی جو دراصل اس کے مقام موت پر پہنچنے کی تقدیر تھی۔ پس میں نے اس کی وہیں جان قبض کی جہاں مشیت ایزدی میں اس کو مرنا تھا۔

انسان موت سے بچنے کی تدبیر کرتا ہوا موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی ولادتِ باسعادت

فرعون نے دوسری بار مصر میں منادی کرائی کہ بادشاہ اب عورتوں اور بچوں پر اسی طرح جود و کرم کی بارش کرنا چاہتا ہے جس طرح وہ نو ماہ پہلے مردوں پر کر چکا ہے۔ پس ہر عورت اپنے بچے کو جو ایک مہینے کے اندر پیدا ہوا ہو لے کر میدان میں پہنچے۔ بادشاہ کا دیدار کرے اور انعام و اکرام سے بہرہ اندوز ہو۔ بادشاہ نے بچوں کے لیے زریں ٹوپیاں تیار کرائی ہیں جو انھیں میدان میں پہنائی جائیں گی۔

یہ حکم سن کر عورتیں بچوں کے لیے ہوئے خوش خوش میدان میں چلی آئیں۔ بیچاریوں کو کیا خبر تھی کہ ان پر کیا کیا ستم ڈھائے جائیں گے۔ جب جمع ہوگئیں تو سب کے لڑکے چھین کر جلادوں کے سپرد کر دیئے گئے جنھوں نے ایک آن میں ان کے سر کاٹ کر رکھ دیئے۔ فرعون خوش تھا کہ ان میں اس کے دشمن کا سر بھی کٹ گیا۔ مگر وہ بیوقوف نہیں جانتا تھا کہ جس کے ہاتھوں اس کی تباہی مقرر ہے وہ نہیں مر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ میدان میں آئی ہی نہ تھی۔

فرعون نے مزید احتیاط کے طور پر مزید جاسوس عورتیں مقرر کیں کہ وہ خانہ بخانہ پھر کر دیکھیں کہ کوئی لڑکا زندہ تو نہیں رہ گیا۔ چنانچہ ان کو پتا چلا کہ ایک کوچہ میں ایک عورت کا بڑا پرفن لڑکا موجود ہے۔ فرعون نے فوراً سپاہی بھیجے کہ اس گھر کی تلاشی لو اور لڑکے کو لا کر میرے سامنے قتل کر دو۔ جب سپاہی دروازے پر پہنچے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے دہکتے ہوئے تنور میں بچے کو امرِ الٰہی سے ڈال دیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ لڑکا جو حضرت ابراہیم خلیل

اللہ کی نسل سے ہے آگ میں نہیں جل سکتا:

امر آمد سوئے زن از داد گر
کہ زاصل آں خلیل است ایں پسر
درتنور انداز موسیٰؑ را تو زود
تانگہ داریم اش از ہر ناروود
زن بوحی انداخت او را در شرر
برتنِ موسیٰؑ نہ کرد آتش اثر

سپاہی گھر میں گھس گئے بہتیرا تلاش کیا مگر لڑکا کہیں نہ ملا اور آخر مایوس ہو کر چلے گئے۔
ان کے جانے کے بعد ماں نے بچے کو تنور سے نکال لیا اور بچہ پھر گھر میں ہنسنے اور کھیلنے لگا۔
جاسوس عورتوں نے پھر جا کر فرعون کو رپورٹ دی کہ بچہ موجود ہے۔ ماں نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ فرعون نے پھر آدمی بھیجے کہ نہ صرف اس گھر کی تلاشی لو جس میں بچہ ہے بلکہ پاس کے تمام گھروں کا کونہ کونہ چھان مارو اور لڑکا فوراً قتل کے لیے حاضر کرو۔

جب متلاشی گھر کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰؑ کی والدہ ماجدہ کو خدا کا حکم پہنچا کہ اپنے لختِ جگر کو دریائے نیل میں ڈال دے اور ہم پر بھروسا رکھ۔ ہم تجھے بچے سے خوش وخرم ملا دیں گے:

باز وحی آمد کہ در آبش فگن
روئے در امید وارد موکمن
درفگن درنیش و کن اعتمید
من ترابا او رسانم روسفید
مادرش انداخت اندر رُودِ نیل
کار را بگذاشت با نعم الوکیل

ماں نے بچے کو رُودِ نیل میں ڈال دیا اور نعم الوکیل خدا پر بھروسا کر کے بیٹھ گئی۔ فرعون نے جو بھی چال چلی ناکام رہی۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کو مارنے کے لیے سینکڑوں بے گناہ معصوم بچے قتل کر ڈالے مگر حضرت موسیٰؑ کا بال بھی بیکا نہ کر سکا:

صد ہزاراں طفل می کشت از بروں
موسیٰ اندر صدر خانہ در دروں
از جنوں میکشت ہر جابد جنیں
از حیل آں کورچشم دوربین
اژدہا بود و عصا شد اژدہا
ایں بخورد آں را بتوفیقِ خدا
حیل ہاؤ چارہ ہا گر اژدہا است
پیش الا اللہ آنہا جملہ لا است

حضرت موسیٰ علیہ السلام بہتے بہتے فرعون کے محل میں پہنچ گئے۔ اس کی بیوی نے انھیں اپنا بیٹا بنا لیا۔ آپ کی ماں کو بلا کر دایہ مقرر کیا۔ فرعون نے اپنے قاتل کو خود اپنے گھر میں پالا۔ جوان ہوئے تو بارِ نبوت سپرد ہوا۔ ساتھ ہی حکم دیا کہ اپنے پرورش کنندہ کو جا کر سمجھا کہ بندہ ہو کر خدائی کا دعویٰ نہ کرے۔ معجزہ عصا عطا ہوا۔ آپؑ فرعون کے پاس آئے، اسے تبلیغ کی۔ وہ جھلایا مقابلے کے لیے جادوگر بلائے جنھیں نے سانپ بنا کر دوڑا ڈالے۔ حضرت موسیٰ نے عصا ڈالا جو اژدھا بن کر مصنوعی سانپوں کو چٹ کر گیا۔ فرعون اس وقت خوفزدہ ہو کر توبہ کے لیے تیار ہو گیا مگر پھر وزیر ہامان نے بہکا دیا کہ اتنے برس خدائی کی اب بندگی کا اعلان کرو گے تو بڑی سبکی ہو گی۔ فرعون پھر اکڑ گیا۔ حضرت موسیٰؑ کے تعاقب میں لشکر لے کر روانہ ہوا۔ دریائے نیل پر پہنچے تو حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ عصا مارو۔ دریا پھٹ کر ادھر ادھر ہو گیا۔ خشک راستہ نکل آیا۔ مومن پار اتر گئے۔ فرعون نے بھی راہ خشک دیکھ کر لشکر

سمیت اندر قدم رکھا تو دریا پھر آملا اور فرعون اور فرعونی سب غرق ہو گئے:

نیل رابر قبطیان حق خوں کند
سبطیاں از بلا محصوں کند
آب بر فرعون وردم خوں شود
بر کلیمے قند نامنون شود
لطف او عاقل کند مر پیل را
قہر او ابلہ کند قابیل را

نیل کا پانی بنی اسرائیل کے لیے رحمت بن گیا اور فرعونیوں کے لیے قہر۔ جب کوئی فرعونی پینے لگتا تو پانی خون ہو جاتا اور سبطی کے لیے نوش خوشگوار۔ ایک دفعہ ایک قبطی (فرعونی) نے اپنے موسائی دوست سے بصد منت پانی مانگا۔ اس نے دریائے نیل سے ایک پیالہ بھرا پہلے خود پیا پھر قبطی کے منہ سے لگایا کہ پی لے لیکن اس کے لب کے ساتھ لگتے ہی پانی نے خون کی صورت اختیار کر لی۔ اس نے پوچھا بھائی سبطی یہ کیا معاملہ ہے وہی پانی اگر تو پیے تو اصلی شکل پر قائم رہے میں پینے لگوں تو لہو بن جائے۔ سبطی نے کہا حضرت کلیم اللہ کا دوست بن جا کہ تیرے لیے آب خون نہ ہو۔

جس چیز سے اللہ تعالیٰ کسی کو محروم کر دے۔ وہ اس کی قسمت میں نہیں ہو سکتی۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور گڈریا

حضرت موسیٰ ایک دن جنگل میں جا رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک بھیڑ بکریاں چرانے والا (گڈریا) سروپا برہنہ کیے دست بستہ کھڑا ہے اور بڑے شوق سے کہہ رہا ہے کہ اے خدا میرے پاس آ کر بیٹھ تاکہ میں تیری جوتی سیوں۔ تیرے سر میں کنگھی کروں، تیری جوئیں ماروں، میں تیرے ہاتھ پاؤں دھوؤں، تجھے نہلاؤں، صاف ستھرے کپڑے پہناؤں اور تجھ پر قربان ہو ہو جاؤں۔ اگر تو میرے پاس آئے تو اپنا کمبل بچھا کر تجھے اس پر بٹھاؤں اور بکریوں کا تازہ تازہ گرم دودھ تجھے پلاؤں۔ اگر تو بیمار ہو جائے تو تیری اپنوں کی طرح خدمت کروں، تیرے ہاتھ چوموں، تیرے پاؤں دبا کر تجھے میٹھی نیند سلاؤں۔ جب صبح خواب استراحت سے بیدار ہو تو تیرا منہ دھلاؤں۔ تیرے کھانے کے لیے قورمہ، قلیا، پلاؤ، پنیر، کوفتے، مکھن، ملائی، اور کھیر تیار کراؤں، اپنے ہاتھ سے تجھے کھلاؤں۔ اگر تو مجھے اپنا گھر دکھا دے تو میں تا زندگی تیرے ہاں دودھ اور مکھن پہنچا دیا کروں۔ میری تمام بھیڑ بکریاں تجھ پر قربان۔

حضرت موسیٰ نے اس کی یہ مستانہ باتیں سنیں اور قریب جا کر پوچھا کہ تو کس سے یہ باتیں کر رہا ہے، تو کس کا میزبان بننا چاہتا ہے، تجھے کس کو اپنے ہاں دعوت پر بلانے کی اس قدر آرزو ہے؟ گڈریا بولا: میں اس سے ہم کلام ہو رہا ہوں جو میرا پیدا کرنے والا ہے۔ جس نے مجھے بولنے کے لیے زبان دی۔ مجھے یہ بھیڑ بکریاں عطا کیں جن کے دودھ کو میں اپنی غذا اور جن کی پشم سے میں اپنا لباس بناتا ہوں۔ جس نے مجھے یہ چیزیں دیں ہیں میں اس

کے دیے سے اس کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مجھ غریب کے گھر تشریف لے آئے تو میں خوشی سے پھولے نہ سماؤں۔ میری آبرو بڑھ جائے گی اور اس کی شان میں کچھ فرق نہ آئے گا۔

حضرت موسیٰ نے کہا گڈریے! تیرا کلام بڑا گستاخانہ ہے۔ تو خدا سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ وہ تو سب کا رازق ہے، اسے کسی کھانے کی احتیاج نہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے نہ اسے نیند آتی ہے۔ تو اس کے پاؤں کیا دبائے گا، تو کیا سمجھتا ہے کہ اس کا تیرے جیسا جسم ہے؟ جان لے اور یقین کر لے کہ اس کا کوئی جسم نہیں۔ اس کے تیرے جیسے ہاتھ پاؤں نہیں وہ سب چیزوں سے بے نیاز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ سب کا حاجت روا ہے، وہ تیرے ساتھ کمبل پر بیٹھ کر تیری بکریوں کا دودھ نہیں پی سکتا۔ دیکھ فاطمہ عورتوں کے لیے کیسا برگزیدہ نام ہے، اگر تو کسی مرد کو فاطمہ کہہ کر پکارے گا تو وہ یقیناً تیرے گلے کا ہار ہو جائے۔ بس ایسے بے ادبانہ کلام سے توبہ کر۔

حضرت موسیٰ نے اس غریب گڈریے کو اس قدر دبایا کہ، بالکل سہم گیا اور کہنے لگا اے موسیٰ تو نے میری زبان بند کر دی۔ میرا منہ سی دیا اور پشیمانی پیدا کر کے میرا دل جلا دیا۔ پس وہ چیخ مار کر اور کپڑے پھاڑ کر ایک طرف جنگل کو نکل گیا۔ اور نبی وقت کا حکم سن کر اس نے اللہ سے اپنی شوق بھری ہم کلامی چھوڑ دی اور اپنا ارمان دل ہی دل میں دبا کر بیٹھ رہا۔

وہ گڈریا پڑھا لکھا آدمی نہ تھا کہ سوچ سمجھ کر شائستہ بات کرتا ہاں اس کے دل میں خدا کی محبت ضرور تھی کہ وہ کمال شوق سے اس کا اظہار کر رہا تھا۔ خدا کو اس کی یہ ذوق و شوق کی باتیں پیاری لگتی تھیں۔ جب وہ ان سے رک گیا تو اللہ کو ناگوار معلوم ہوا۔ فوراً اس نے اپنے کلیم کی طرف وحی بھیجی کہ تو نے ہمارے ایک محب کو ہم سے جدا کر دیا۔ اے موسیٰ ہم نے تجھے اس لیے نبی بنایا تھا کہ تو بندوں کو ہم سے ملائے مگر تو نے اپنے فرض منصبی کو چھوڑ کر اور راہ اختیار کر لی۔ اے موسیٰ ہم نیتوں کو دیکھتے ہیں عملوں کو نہیں دیکھتے۔ ہماری نظر حال پر ہے

قال پر نہیں۔ ہمیں دلی سوزی کی قدر ہے لفظوں کا خیال نہیں۔ جا اور اپنے جدا کردہ بندے کو پھر اپنے شغل میں لگا کہ ہم کو وہی محبوب ہے۔ مولانا نے جن موثر اشعار میں مضمون بالا کو ادا کیا ہے۔ ان کا نقل کرنا نہایت ضروری ہے:

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

تا توانی پامنہ اندر فراق
ابغض الاشیاء عندی الطلاق

ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم
ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم

درحق او مدح درحق تو ذم
درحق او شہد درحق تو سم

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ
از گراں جانی و چالاکی ہمہ

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

من نگردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم اشاں شوند و درفشاں

مابروں را ننگریم و قال را
مادروں را بنگریم و حال را

موسیٰا آداب داناں دیگرند
سوختہ جان و رواناں دیگرند

عاشقاں را ہر نفس سو زیدنی است
بردہ ویراں خراج و عشر نیست
گر خطا گوید ورا خاطی مگو
گر شود پرخوں شہید آں رامشو
خون شہیداں راز آب اولیٰ تراست
ایں خطا ازصد صواب اولیٰ تراست
در درون کعبہ رسم قبلہ نیست
چہ غم ارغواص را پا چیلہ نیست
ملت عشق از ہمہ دینہا جدا است
عاشقاں را ملت و مذہب خدا است

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ حکمِ الٰہی سن کر پھر جنگل کو آئے اور بعد از تلاش بسیار اس گڈریے کو ڈھونڈا اور کہا کہ بھائی! اپنی مناجات میں لگے رہو اور جو میں نے تمھیں روکا تھا اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ تمھاری محبت اور سوز میں ڈوبی ہوئی باتیں خدا کو پیاری لگتی ہیں۔ اپنے شغل میں مصروف رہو اور مجھے معاف کر دو کہ میں تمھارے وظیفہ میں خلل انداز ہوا:

ہیچ آدابے و ترتیبے مجو
ہرچہ مے خواہد دل تنگ مگو
کفر تو دین است و دینت نورجاں
ایمنی وزتو جہانے در اماں

اللہ تعالیٰ نیتوں کو دیکھتا ہے۔ ظاہری اعمال پر اس کی نظر نہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور ایک بکری

حضرت موسیٰؑ پیغمبری ملنے سے پہلے بکریاں پال کر قُوت (روزی) حلال کیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک ریوڑ سے ایک بکری پیچھے رہ گئی اور رات بھر جنگل میں بھٹکتی پھری۔ حضرت موسیٰؑ کو اس کی حالت پر رحم آیا کہ اگر وہ رات کو باہر رہی تو اسے کوئی بھیڑیا چیر پھاڑ نہ ڈالے اور بے چاری کی جان مفت میں جائے گی۔ اسی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر آپ اس کی تلاش کو نکلے۔ تمام رات ڈھونڈتے رہے۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے اور آبلوں نے کانٹوں سے پھوٹ کر پاؤں کو زخمی کر دیا۔ تکان اور کوفت سے بدن سراپا درد بن گیا۔ ٹانگیں سوج کر جواب دے بیٹھیں۔ صبح کے وقت ایک بکری ملی جو تھک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی چرواہا ہوتا تو بکری کو مار مار کر ادھ موا کر دیتا کہ کمبخت تو نے تھکا تھکا کر مجھے مار ڈالا مگر حضرت موسیٰؑ مطلق ناراض نہ ہوئے بلکہ اسے پیار کرنے لگے۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ سے رال صاف کی۔ بال جھاڑے، پاؤں دبائے اور فرمانے لگے اے بکری مجھ سے کیا خطا ہوئی تو میرے گلے سے جدا ہو گئی؟ میں نے مان لیا کہ تجھے میری پروا نہ تھی مگر تو نے اپنی تکلیف کو بھی نہ دیکھا۔ بکری کے دست و پا سردی سے اکڑے ہوئے تھے۔ وہ چل پھر نہ سکتی تھی آپؑ نے اسے اپنی گود میں ایسی الفت سے اٹھا لیا جیسی کہ ماں کے دل میں بھی نہ ہو۔ خدا کو اپنی ایک بے زبان مخلوق سے حضرت موسیٰؑ کی یہ ہمدردی بہت بھائی۔ اس نے فرشتوں سے کہا کہ دیکھا موسیٰؑ کا حوصلہ:

شایاں اس کو قوم کی ہے سروری
یہ ہے بے شک لائق پیغمبری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **سید القوم خادمھم:**

قوم کا سردار ہے وہ نیک خو
قوم کا خادم جو جانے آپ کو

اسی ارشاد نبویؐ پر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے عمل کیا اور ظاہر و باطن میں اسلام کا سکہ بٹھا دیا۔ جب سے سنت شیخین پر عمل چھوٹا رشتہ مہر و عدل ٹوٹا:

مصطفیٰ فرمود خود کہ ہر نبی!
کرد چوپا نیش برنا یا صبی!
بے شبانی کردن و آن امتحاں
حق نداد ش پیشوائی جہاں!
تا شود پیدا وقار و صبر شاں!
کردشاں پیش از نبوت حق شباں

یعنی رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے خواہ حالت طفلی یا جوانی میں چوپانی (گلہ بانی) نہ کی ہو۔ جب انبیاء گلہ بانی کے امتحان میں پاس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا کر دی۔

حضرت عیسیٰؑ اور بیوقوف

زاحمقان بگریز چوں عیسیٰؑ گریخت

صحبت احمق بسے خونہا بریخت

ایک شخص نے ایک دفعہ دیکھا کہ حضرت عیسیٰؑ جنگل میں بڑی تیزی سے دوڑے جارہے ہیں اور پیچھے مڑ مڑ کر اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی کسی کے خوف سے بھاگا ہوا شخص دیکھتا ہے۔ دم چڑھا ہوا قدم تھک کر رہے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی حضرت مسیحؑ کہیں دم نہیں لیتے۔ اس شخص نے پوچھا! حضرت کیا ماجرا ہے۔ آپ پھر بھی نہ ٹھہرے بلکہ زیادہ تیزی سے دوڑنے لگے۔ یہ مرد بھی دھن کا پکا تھا۔ دامن باندھ کر پیچھے ہولیا۔ جب اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا تو عرض کی یا روح اللہ! آپؑ کو اللہ کی قسم جواب آپؑ ایک قدم بھی آگے بڑھے۔ آپؑ کھڑے ہوگئے۔ اس نے پوچھا کہ کیا تعاقب میں کوئی شیر یا بھیڑیا تھا یا کسی دشمن نے پیچھا کیا ہوا تھا کہ آپ اس طرح دوڑے جارہے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہ سن کر قہقہہ مارا اور کہا کہ میں چلا جارہا تھا کہ مجھے ایک احمق دکھائی دیا۔ میں اس سے تیر کی طرح بھاگا۔ یہ سن کر وہ شخص بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا یا حضرت! آپؑ اللہ کے رسول ہیں آپؑ کی دعا فوراً قبول ہوتی ہے۔ آپؑ کو وہ اسم اعظم یاد ہے جس سے ہر مصیبت ٹل جاتی ہے۔ آپؑ قم باذنی (اٹھ میرے حکم سے) کہہ دیں تو مردے جی اٹھیں، لنگڑے، لولے، اندھے، دیوانے، جذامی (کوڑھی) آپؑ کی ایک چھو سے بھلے چنگے ہوکر چلنے پھرنے لگیں۔

کیا احمق کا علاج آپ نہیں کر سکتے! یہ سن کر حضرت مسیح نے جواب دیا جو کچھ تو نے کہا سب سچ ہے، مجھے خدا نے مردوں کو زندہ کرنے کی قوت دی ہے۔ لاعلاج امراض کے رفع کرنے کی طاقت بخشی ہے مگر (حمق) بے وقوفی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ بیماری ایک مصیبت ہے جسے دیکھ کر خدا کو بھی رحم آتا ہے مگر حمق خدا کا قہر ہے۔ مقہور شخص ہمیشہ خستہ حال رہتا ہے۔ اسے میری چھو اور دعا کارگر نہیں ہو سکتی:

ہر مرض کی ہے دوا لیکن حماقت کی نہیں
عقل کے اندھوں کی ہو اصلاح! ممکن ہی نہیں

حضرت محمد ﷺ کے نام کی پنجوقتی نوبت اور مدامی سکہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں میں تبلیغ شروع کی تو انھوں نے سمجھا کہ یہ شخص ہماری سرداری چھیننا چاہتا ہے۔ وہ سب لوگ جمع ہو کر آپؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے محمدؐ! اگر تو سردار بننے کے لیے تبلیغ کر رہا ہے تو ہم تجھے سرداری کے کچھ حصے دے دیتے ہیں۔ بانٹ کر بے شک کھا لیکن ساری نہ اڑا۔ آپؐ نے فرمایا جسے اللہ سروری بخشے اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ وہ بولے تیرے پاس کیا ہے، سردار تو درحقیقت ہم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمھاری سرداری چندروزہ ہے اور میری مدامی:

میری من تا قیامت باقی است
میری تو عاریتی خواہد شکست

سرداروں نے کہا کہ اس کے لیے دلیل! آپؐ نے فرمایا خدا ابھی ظاہر کر دے گا۔ اسی وقت ابر محیط آسمان ہوا اور اس قدر مینہ برسا کہ تمام الامان والحفیظ پکار اٹھے۔ سیل نے شہر کا رخ کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب امتحان کا وقت آ پہنچا، اَب اپنی امیری کے بل پر سیل کو روکو۔ تمام امیروں نے بندش سیل کے لیے اپنے نیزے زمین میں گاڑ دیے۔ پانی کی ایک رو آئی اور تمام نیزے پرکاہ کی طرح بہا کر لے گئی۔ اب رسولؐ نے اپنا عصا پانی میں ڈال دیا جو سطح آب پر قائم رہا۔ اس کی برکت اور اثر سے طوفان فوراً تھم گیا اور اس کا رخ شہر کی طرف سے بدل گیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر بہت سے امیر ایمان لے آئے مگر ابولہب اور ابوجہل یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ بڑی جادوگری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اگر تم نے امیروں کو نیزے گاڑتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عصا گاڑتے نہیں دیکھا تو اتنا تو دیکھو کہ اب تک نیک نام کس کا باقی ہے۔ دشمنان محمدؐ کا نام مٹ گیا مگر آنحضرت کا نام ہمیشہ زندہ و پائندہ ہے۔ آپؐ کے نام کی نوبت ہر روز دنیا کے ہر حصہ میں پانچ وقت بجتی ہے اور قیامت تک بجتی رہے گی مگر آپؐ کے دشمنوں کا کوئی نام لیوا نھیں۔ ''مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔''

نام شاں را سیل تیز مرگ برد
نام او و دولت تیزش نمرد
پنج نوبت مے زنندش بر و دوام
ہمچنیں ہر روز تا روز قیام
سکہ شاہاں ہمے گردد دگر
سکہ احمدؐ بہ بیں تا مستقر

نبی مکرمؐ اور صدیقِ اکبرؓ کی راست گوئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دشمنوں کے ظلم سے تنگ اور ان کی بدسلوکی سے ناراض ہو کر ہجرت کا عزم کر لیا۔ آپؐ کے بستر پر حضرت علی المرتضیٰؓ حضور کی چادر تان کر لیٹ رہے تاکہ دشمن دھوکے میں رہیں اور سمجھیں کہ حضورؐ سو رہے ہیں۔ دشمنوں نے پہرہ ہلکا کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صدیق اکبرؓ کو ساتھ لے کر تاریکی میں چل دیے۔ وطن سے رخصت ہوتے وقت دل تو بہت کڑھا مگر مقتضائے وقت یہی تھا کہ ہجرت کی جائے۔ ایک جگہ ناکے پر پہرہ دار تھے وہ دور سے دیکھ کر کہنے لگے: ''تم کون ہو؟'' حضور نے اپنے یارِ غارؓ سے فرمایا یہ امتحان کا وقت ہے جھوٹ ہرگز نہیں بولنا چاہیے۔ ہماری جان کا حافظ خدا ہے۔ اے جاں نثار صدیقؓ! جھوٹ بول کر مجھے قیامت کے دن شرمسار نہ کرنا۔ دروغ گوئی اور کذب بیانی سے جان نہیں بچ سکتی۔ جن وانس کی جانوں کا محافظ اللہ ہے۔ ابوبکرؓ! تیرا نام صدیق ہے۔ سچ کہہ دے کیونکہ جھوٹ بولنا مردوں کا کام نہیں چنانچہ پہرے داروں کو صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم ہم دونوں محمدؐ اور ابوبکرؓ ہیں۔ یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور دشمن کی بات ہنسی میں اڑا دی۔ پہرے دار یہ سن کر کہنے لگا: یہ تمسخر سے ایسا کہتے ہیں اور ہماری ہنسی اڑاتے ہیں اگر یہ واقعی محمدؐ اور ابوبکرؓ ہوتے تو اپنا نام کیوں بتاتے؟

اس وقت ان کو جان کا پورا خطرہ تھا مگر دونوں نے مصلحت وقت کی کچھ پروا نہ کی اور ایسے خطرناک وقت پر بھی جھوٹ نہ بولا۔ خدا نے ان کو دشمنوں سے بچا لیا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ سانچ کو آنچ نہیں۔

سرورِ کائناتؐ کی شان میں بدزبانی کرنے والا مسخرہ

حضرت رحمتہ للعالمینؐ کے زمانہ میں ایک بےادب مسخرہ تھا۔اس نے شامتِ اعمال سے ایک دن شرارت سے اپنا منہ ٹیڑھا بنایا اور اس ٹیڑھے منہ سے بطور تمسخر حضورؐ کا نام (احمدؐ) لیا۔خدا نے اسے وہیں بےادبی کی سزا دے دی اور اس کا منہ واقعی ٹیڑھا ہوگیا۔اپنی بدنما صورت دیکھ کر وہ سخت گھبرایا اور ایسی حرکت پر بڑا شرمندہ ہوا۔دل نے کہا اسی کی درگاہ میں جا کر خطا معاف کراؤ۔جس کی ذات رؤف ورحیم ہے اور جو سراپا رحمت ہے۔پس وہ کج دہان اپنے فعل پر اظہارِ ندامت کرتا ہوا حاضر دربارِ نبویؐ ہوا اور گڑگڑا کر یوں معافی طلب کرنے لگا:

در پہ آیا ہوں میں تیرے مصطفیؐ
بخش دیجئے سب میرے جرم و خطا
تجھ پہ ہیں علم خفا کے در کھلے
واسطے تیرے سما کے در کھلے
جو پھرا تجھ سے ہوا فوراً فنا
سر جھکایا جس نے وہ کندن ہوا
جو کیا میں نے حماقت تھی وہ سب
جو کہا میں نے جہالت تھی وہ سب
مجھ سے مولیٰ سخت نادانی ہوئی

دل میں پیدا اب پشیمانی ہوئی
رحم کر اے رحمتہ للعالمینؐ
اب میرا تیرے سوا کوئی نہیں

جب وہ اپنے کیے پر نادم ہو کر طالب معافی ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دریائے رحمت جوش میں آیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جا میں نے تیری خطا بخش دی چنانچہ اس کا ٹیڑھا منہ عفو کا حکم صادر ہوتے ہی سیدھا ہو گیا۔

حضرت محمدؐ کے در پر جو آ گرا وہ نجات پا گیا۔ مولانا فرماتے ہیں:

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درو
میلش اندر طعنہ پاکاں برو
در خدا خواہد کہ پوشد عیب کس
کم زند در عیب معیوباں نفس
چوں خدا خواہد بما یاری کند
میل مارا جانب زاری کند
اے خنک چشمے کہ آں گریاں اوست
دے ہمایوں دل کے آں بریاں اوست
آخر ہرگز بہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست
ہر کجا آب رواں سبزہ بود!
ہر کجا اشکے رواں رحمت بود
اشکے خواہی رحم کن بر اشکبار
لطف خواہی برضعیفاں رحم آر

ربّ کریم کا کملی پوش پیغمبرؐ

شب بیدار محمد مصطفیؐ کی ایک رات کہیں آنکھ لگ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ اے روح الامینؑ جا اور میرے حبیبؐ کے تلوے سہلا اور اس طرح جگا کر کان میں عرض کر خدا بعد از سلام عرض کرتا ہے کہ یا یھا المزمل (اے کملی والے پیارے) ہمیں تیرے خواب پسند نہیں بلکہ بیداری محبوب ہے۔

اپنی کملی سے سر باہر نکال کیونکہ تیرے سونے سے جہاں سو جائے گا۔ تو دنیا کے سرگردان جسم کے لیے ہوش ہے۔ تو شمع ہے، شمع کا کام کھڑے ہو کر روشنی پہنچانا ہے۔ تیرا نورِ ضیاء پاش نہ ہو تو روز روشن تاریک نظر آئے۔ تیری پناہ نہ ہو تو شیر کو خرگوش قید کر لے۔ اے خضرِ وقت نوح کی طرح کشتی بان ہو کر لوگوں کو ہلاکت سے بچا کر نکال لے جا اور اس کی پروا نہ کر کہ دشمن تیری مخالفت کرتے ہیں۔ تو ہادی ہے ہدایت کیے جا۔ دیکھ چاند آسمان پر طلوع ہو کر نور برسا رہا ہے اور کتے بھونکتے ہیں مگر چاند کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اسی طرح تیرے حاسد بھی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ جو کوئی ایک اندھے کو چالیس قدم آگے پہنچائے وہ بخشا جاتا ہے۔ تجھے تو اندھوں کی قطاروں کی قطاریں منزل مقصود تک پہنچانا ہیں۔ جو کوئی تیری راہ میں روڑے اٹکائے گا ہم اس کی گردن توڑ کر رکھ دیں گے۔ جو تیری رہنمائی سے متمتع نہ ہونا چاہے گا ہم اسے اندھا کر دیں گے۔ اگر وہ زہر کھانا ہی پسند کرے گا تو ہم اسے زہر دیئے جائیں گے اور وہ اسے شکر سمجھ کر کھائے جائے گا۔ پیارے جاگ! تا کہ تیرے

جاگنے سے ہزاروں مردے جی اٹھیں، تو وقت کا اسرافیل ہے قیامت سے پہلے قیامت برپا کردے:

آیۂ رحمت ہے تو میرے حبیبؐ
شافع امت ہے تو مرے حبیبؐ
رحمتِ عالم ہے تو پیارے رسولؐ
شوق سے تو کر دعا ہو گی قبول
اے محمدؐ ہم نہیں کرتے پسند
یہ کہ پہنچے تری امت کو گزند
استراحت کی جانب نہ میل کر
بہر امت کر دعا اب تا سحر
بخشوانا اس کا ہے گر مدّعا
آپؐ امت کے لیے زحمت اٹھا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی وقت اٹھے اور غارِ حرا کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں سجدے میں گر کر دعا مانگنے لگے:

در پہ حاضر ہے تیرے اے ذوالجلال
بندہ افسردہ دل آشفتہ حال
در پہ حاضر ہے یہ تیرا مصطفیٰؐ
در پہ حاضر ہے یہ غم کا مبتلا
جب تلک تو میری امت کے گنہ
اپنی رحمت سے نہ بخشے گا اِلٰہ

یہ تیرا بندہ تیرا پیارا نبیؐ
سر اٹھائے گا نہ سجدہ سے کبھی

اے امت محمدؐ یہ اپنی خوش قسمتی پہ ناز کر! تیری بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کو خواب استراحت سے جگا کر دعا کرنے کا حکم کرتا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں کہ اس کے حبیبؐ کی امت عذاب اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کی رضائے بخشش اور اس پر حبیبؐ خدا کی شفاعت سونے پہ سہاگے ہوگی۔ یا اللہ ہم تیرے حبیبؐ کی شفاعت سے تیری بخشش کے امیدوار ہو سکتے ہیں ورنہ ہمارے اعمال تو اس قابل ہیں کہ ہم دوزخ کا ایندھن بنیں۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ایک بدزبان کی ہرزہ سرائی

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دن وعظ فرمار ہے تھے۔ ہر لفظ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سب لوگ اس سے متاثر ہور ہے تھے۔ ایک سفلہ خود شمن بھی وہاں کھڑا تھا وہ بول اٹھا: لوگو! اس کی بات نہ سنو۔ اس نے مکر کا جال بچھا رکھا ہے۔ سب ظاہر داری ہے اصل کچھ بھی نہیں۔ اس کے باپ کا بھی پتہ نہیں کون تھا۔ مال و دولت بھی اس کے پاس نہیں۔ ہر وقت بے نواؤں کی طرح ادھر ادھر پھرتا رہتا ہے۔ ماں کی خدمت کی بھی اسے کوئی پروا نہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ شریعت پر چلو اور اللہ کے احکام پر عمل کرو۔ کبھی کہتا ہے جو دل میں آئے کرو۔ خدا کو تمھاری عبادت کی احتیاج نہیں۔ اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ کہیں شاہی مل جائے۔ کبھی کہتا ہے کہ قیصر کی اطاعت فرض ہے۔ میں تو آسمانی بادشاہ ہوں۔ تمھیں خراج دنیاوی بادشاہ کو دینا چاہیے۔ الغرض اس کا تمام کام لاابالی ہے، کہیں معقولیت کا نام نہیں۔ ایسے آدمی کے چال چلن کا بھی اعتبار نہیں ہوسکتا۔ کبھی زاہد بن بیٹھتا ہے اور کبھی شراب پینے لگتا ہے۔ اشراف میں سے کوئی بھی اس کا رفیق نہیں۔ اس کے جال میں جو دس بارہ الو پھنسے ہیں۔ ان میں سے کوئی مچھیرا ہے کوئی دھوبی، کوئی جلاہا ہے کوئی تیلی۔

اس کی تقریر سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: اے بھائی! خدا تجھ پر رحمت کرے۔ میں تیرا ممنون ہوں کہ تو نے مجھے میرے عیبوں سے مطلع کیا۔ اس پر اس بدمعاش نے اور گالیاں دینا شروع کردیں۔ وہ دشنام دیتا آپؑ دعا دیتے۔ آخر ایک گھنٹہ بکواس کر

کے وہ تھک کے چل دیا۔ ایک حواری نے روح اللہ سے عرض کیا۔ حضرت اس نابکار کی طرف سے یہ سختی اور جفا اور آپؑ کی جانب سے یہ نرمی اور دعا؟ آپؑ کو جواب ترکی بہ ترکی دینا لازم ہے۔ آپؑ نے فرمایا بھائی میں لاچار ہوں۔ جو کچھ اندر ہو وہی باہر ہوتا ہے۔ مجھ میں خدا نے رحمت بھری ہے۔ میں کسی پر سختی کیسے کرسکتا ہوں:

نیک سے نیکی ہو اور بد سے بدی

ظرف میں جو ہو گا ٹپکے گا وہی

حضرت رسالتمآب ﷺ اور ایک گنہگار شخص

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نفس کے ہاتھوں بہت تنگ ہوں ۔ سر سے لے کر پاؤں تک میں گناہوں میں غرق ہوں ۔ مجھ جیسا کوئی گنہگار نہیں ۔ عیبوں میں آدھی صدی گزر گئی اور بدی جزو عادت بن گئی میری دستگیری فرمایئے ورنہ گنہگاری میں ہی جان نکل جائے گی ۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا تم میں کون کون سے عیب ہیں ۔ اس نے عرض کیا چار (1) زنا (2) شراب خوری (3) چوری (4) دروغ گوئی ۔ آپؐ نے فرمایا جھوٹ بولنا چھوڑ دو باقی عیب بھی ان شاء اللہ چھوٹ جائیں گے ۔ دیکھنا ارادہ مضبوط رہے اور توبہ نہ ٹوٹے ۔ وہ بولا یا رسول اللہؐ خدا اور آپؐ کے سر کی قسم میں عہد کرتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا ۔ اگر میری زبان سے دروغ سرزد ہوا تو میں اسے کاٹ نکالوں گا ۔

رات کو اس نے شراب پینے کا ارادہ کیا پھر سوچا اگر حضورؐ نے پوچھا کہ شراب پی تھی تو کیا جواب دوں گا ۔ جھوٹ تو بول نہیں سکتا ۔ سچ کہوں تو مجھ کو حد جاری ہوگی ایک رسوائی ، دوسرا عذاب ۔ یہ سوچ کر اس نے شراب نوشی سے بھی توبہ کر ڈالی اور شراب کے تمام برتن (خم ، مینا اور جام) توڑ ڈالے ۔ پھر اس نے زنا کا ارادہ کیا مگر پھر سوچ کر کہ حضورؐ پوچھیں گے تو سچ بولنا ہوگا ۔ جس پر زنا کی سخت سزا (سنگساری) ملے گی ۔ ذلت بھی ہوگی اور جان بھی عذابوں سے نکلے گی ۔ اس گناہ سے بھی توبہ کرنی چاہیے ۔ چنانچہ وہ زنا کاری سے بھی باز رہا ۔

پھر اس کو چوری کا لالچ آیا مگر یہاں بھی ترک کذب کا عہد مانع ہوا۔ دل نے کہا کہ اگر چوری کا اقرار کروں تو ہاتھ کاٹا جائے گا اگر جھوٹ بولوں گا تو عاقبت خراب ہوگی۔ آؤ اس سے بھی توبہ ہی کرو۔ چنانچہ اس نے چوری سے بھی توبہ کرلی۔ اس کے بعد وہ ایک دن حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا اور پائے اقدس پر گر کر عرض کرنے لگا کہ یا حضرت! آپؐ کے حکم سے میں نے ایک جھوٹ ترک کیا تو سب عیب چھوٹ گئے۔

الصدق ینجی و الکذب یھلک ۔ سچ بچاتا ہے اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ستونِ حنّانہ

حضرت محمدؐ ایک خشک خرما کے درخت کے ساتھ کھڑے ہو کر مسجد میں وعظ فرماتے تھے پھر جب منبر بن گیا تو آپؐ اس پر تشریف فرما ہوئے۔ آپ منبر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ رونے کی اس طرح آواز آئی کہ جس طرح کوئی بچہ بے خود ہو کر گریہ وزاری کرتا ہے۔ مجلسِ وعظ میں حیرت چھا گئی کہ یہاں رونے والا کون ہے۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ یہ صدائے گریہ ستون مسجد سے آرہی ہے اور وہی حنّانہ (نالاں) ہے۔ حضور منبر سے اتر کر ستون کے پاس آئے اور پوچھا روتے کیوں ہو؟ کیا چاہتے ، ہو اس نے عرض کیا: حضورؐ کے غم فراق سے دل خون اور آتش ہجر سے جگر جل کر کباب ہو گیا ہے۔ آپؐ میرے ساتھ ٹیک لگا کر قیام فرمایا کرتے تھے اور اب مجھے چھوڑ کر منبر پر جا بیٹھے۔ میں روؤں نہ تو اور کیا کروں؟ حضورؐ نے فرمایا اے پیارے درخت تو بڑا خوش قسمت ہے اب بتا تو کیا چاہتا ہے؟ اگر تو کہے تو تجھے پھر سے ہرا بھرا کر دیا جائے اور تو اس قدر پھلے کی مشرق اور مغرب کے رہنے والے تیرے میوے سے شادکام ہوں اور اگر تیری مرضی ہو تو دوسرے جہان میں سرو سہی بنا دیا جائے تاکہ تو وہاں ہمیشہ تر و تازہ رہے۔ ستون حنا نے عرض کی کہ مجھے بقائے دوام مطلوب ہے۔ حضورؐ نے اسے زمین میں دفن کر دیا کہ وہ روز قیامت آدمیوں کی طرح محشور ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور خواہش بقائے دوام میں اے غافل! تو ستون سے کم نہ ہو جو خدا کا بندہ بن جاتا ہے اسے اس دنیا کی کچھ محبت نہیں رہتی:

تا بدانی ہر کہ ایزد آں بخواند

از ہمہ کار جہاں بے کار ماند

سرورِ کائناتؐ ایک کافر مہمان کی میزبانی فرماتے ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم شام کے وقت مسجد نبوی میں اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ چند نو وارد کافر وہاں آئے اور بولے کہ ہم مسافر ہیں۔ ہمارے طعام و قیام کا بندوبست کردیں۔ اے محمدؐ ہم نے سنا ہے کہ آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ سب بادشاہوں اور بندوں کے دستگیر۔ حضورؐ نے یاران کبار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ آؤ ہم سب ایک ایک مہمان آپس میں تقسیم کرلیں۔ چنانچہ سب اپنا اپنا مہمان لے کر گھروں کو روانہ ہو گئے۔ حضورؐ کے لیے جو باقی رہا وہ بڑا بدمزاج اور پر خور تھا۔ وہ مسجد میں اس طرح پڑا رہا جیسے جام میں میل۔ حضورؐ اس کو اپنے ہاں لے گئے۔ اس وقت آپ کی سات بکریاں شیر دار تھیں۔ وہ تمام کا دودھ پی گیا اور گھر میں جتنا کھانا پکا تھا وہ بھی شرارت سے چٹ کر گیا۔ حضور نے اسے علیحدہ سونے کے لیے حُجرہ دے دیا۔ خادمہ کو اس کی شرارت پر بڑا رنج تھا۔ وہ آئی اور دروازہ باہر سے بند کر گئی۔

آدھی رات ہوئی تو اسے درد شکم ہوا اور دست آنے لگے۔ وہ اندر ہی قضائے حاجت کرتا رہا۔ اس نے تمام کپڑے بھی خراب کر دیئے۔ حضور اکرمؐ نے صبح آ کر دروازہ کھولا اور آواز دی کہ بیدار ہو اور خود عمداً ایک طرف ہو گئے تا کہ وہ شرمندہ نہ ہو دروازہ کھلا دیکھ کر وہ آہستگی سے باہر نکلا اور نظر بچا کر بھاگ گیا۔

ایک شخص نے اس کافر کے نجس کردہ کپڑے حضورؐ کے سامنے پیش کیے اور بولا دیکھیے حضرت اس شخص کے کرتوت۔ آپؐ ہنسے اور فرمایا کہ کچھ فکر نہیں۔ لاؤ میں ان کپڑوں کو اپنے

ہاتھ سے پاک کروں۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! ہماری جانیں اور جسم آپؐ پر قربان۔ یہ ناپاک کپڑے ہم دھوئیں گے کیونکہ یہ ہاتھوں کا کام ہے دل کا نہیں۔ ہم دست و پا ہیں آپؐ جان و دل۔ ہم آپؐ کی خدمت گزاری کے لیے زندہ ہیں۔ آپؐ جب ایسا کرنے لگیں گے تو ہم کس لیے ہیں:

مابرائے خدمت تو مے زیئیم
چوں تو خدمت میکنی پس ماکئیم

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو تم کہتے ہو سچ ہے مگر میرے دھونے میں ایک حکمت ہے جو ابھی ظاہر ہوگی۔

وہ شریر آدمی اپنے ہیکل حجرے میں بھول گیا تھا جب اسے یاد آئی تو تمام حیا، شرم بالائے طاق رکھ کر واپس لوٹا۔ طمع بری بلا ہے یہ حیا باقی چھوڑتی ہے نہ شرم۔ جب واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ خواجہ کون ومکانؐ اپنے دست مبارک سے اس کی نجاست دھور ہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کے دل پر بڑا اثر ہوا اور بے اختیار اس کی چیخیں نکل گئیں اور افسوس سے اپنا سر پیٹنے لگا۔ حضورؐ نے اٹھ کر اسے تسلی دی اور فرمایا کہ کوئی بات نہیں یہ لو اپنی ہیکل:

چوں زحد بیروں بلرزید و طپید
مصطفیٰ اش در کنار خود کشید

یہ دیکھ کر وہ اور بھی شرمندہ ہوا اور معافی مانگنے لگا اور بول اٹھا کہ اسلام برحق اور آپؐ اللہ کے رسول برحقؐ ہیں۔ جھوٹا میرا دین (کفر) جھوٹا۔ لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پس وہ مشرف بہ اِسلام ہو گیا۔ رات کو اس کے سامنے کھانا رکھا گیا تو اس نے بہت کم کھایا اور کہا حالتِ کفر میں میرا دوزخِ شکم کبھی نہ بھرتا تھا اب نورِ اسلام نے مجھے سیر کر دیا ہے:

حرص و وہم و کافری سرزیر شد
اژدہا از قوتت مُورے سیر شد

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابر کرم اور بحر رحمت تھے۔ دوست دشمن سب سے بھلائی ہی کرتے۔ اسی لیے دنیا آپ کی تابع ہوگئی:

کچھ ان کے خلق نے کر لی کچھ ان کے پیار نے کر لی
مسخر اس طرح دنیا شہِ اَبرارؐ نے کر لی

حضرت امام حسنؓ کی شانِ احسان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سبطِ اکبر، سیدہ فاطمہؓ کے لخت جگر امیر المومنین سیدنا حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن لوگوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ غلام شوربے کا بادیہ لے کر حاضر ہوا مگر اتفاقاً ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ شوربہ حضرت حسنؓ کے کپڑوں پر گرا اور ان کو خراب کر دیا۔ آپؓ نے غلام کو غصہ سے گھورا جس سے وہ کانپ اٹھا مگر اسے فوراً قرآن کی یہ آیت یاد آئی۔ اس نے پڑھا والکاظمین الغیظ آپؓ نے فرمایا میں نے غصہ پی لیا۔ جب اس نے کہا والعافین عن الناس آپؓ نے فرمایا جا میں نے تیری خطا معاف کر دی جب واللّٰہ یُحِبُّ المحسنین اس کے منہ سے نکلا تو حضرت حسنؓ بولے۔ جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔

جو لوگ خطا کاروں کی خطا معاف کرتے ہیں اللہ ان کے گناہ بخش دیتا ہے۔

سیدنا صدیق اکبرؓ اور ابوجہل کی بصیرت کا فرق

بادشاہ وقت کو شوق پیدا ہوا کہ جس لیلیٰ کے عشق کو قیس کو مجنوں بنا دیا اسے ضرور دیکھنا چاہیے۔اس نے لیلیٰ کو دیکھا مگر وہ اس کی نظر میں نہ جچی۔اس نے لیلیٰ سے پوچھا کہ کیا تو ہی وہ عورت ہے جس پر قیس سو جان سے قربان ہے؟ تجھ میں کوئی ایسی انوکھی شان دلبری نہیں جس سے تو دوسری حسین عورتوں سے ممتاز نظر آئے۔قیس تیرا مجنوں کیوں ہوا؟

یہ سن کر لیلیٰ نے نہایت مختصر اور برجستہ جواب دیا کہ خاموش! تو مجنوں نہیں ہے۔ مجھے دیکھنے کے لیے قیس کی آنکھ لا اور دیکھ کہ مجھ میں کتنا جنون انگیز جذبہ موجود ہے:

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے جب نبوت کا اعلان کیا تو ابوجہل دشمن جان بن گیا۔ایک دن سامنے آ کر کہنے لگا کہ تم جیسا بدصورت بچہ آج تک کسی قریشی عورت نے نہیں جنا۔حضورؐ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہو۔اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے۔آپؓ نے حضورؐ کے جمالِ جہاں آرا کی طرف دیکھا تو کہا کہ آپؐ جیسا حسین آپؐ جیسا جمیل مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ چاند، سورج، تارے سب آپؐ کے نور کے مقابل ماند ہیں۔آپ دنیا کے لیے رحمت اور زہر کفر کے لیے تریاق ہیں۔حضورؐ نے سن کر فرمایا کہ صدیقؓ سچ کہتے ہو۔حضرت عمرؓ نے سن کر عرض کیا یا رسول اللہؐ صدیقؓ کا قول تو

بالکل راست ہے مگر ابوجہل کاذب کس طرح سچ کہہ سکتا ہے؟ حضور نے فرمایا: اللہ کے رسول آئینے کی طرح ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنی اپنی صورت دکھائی دیتی ہے۔ ابوجہل نے اپنے کفر کی بھونڈی تصویر کو دیکھ کر مجھے بدصورت کہہ دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صدق وصفا کا ملاحظہ کر کے مجھے خوبرو بتایا۔ دونوں نے ٹھیک مشاہدہ کیا۔ لہٰذا میں نے ہر ایک کو صَدَقْتَ کہہ دیا۔

دشمن کو ہنر بھی عیب دکھائی دیتے ہیں اور دوست کو عیب بھی ہنر نظر آتے ہیں۔ مجنوں کی محبت بھری نگاہ میں لیلیٰ کا ہر خط وخال خوبی ومحبوبی کا مرقع تھا اور ابوجہل کی بدبیں نظر میں محبوب رب العالمین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بھی خوبرو نہ تھے۔ لہٰذا بادشاہ کو لیلیٰ نے مولانا کے الفاظ میں یہ جواب دیا:

دیدہ مجنوں اگر بودے ترا
ہر دوعالم بے خطر بودے ترا
باخودی تو لیک مجنوں بے خود است
در طریق عشق بیداری بد است

حضرت علیؓ اور مسئلہ جبر وقدر کا حل

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک شخص گیا جو جبر وقدر کے مسئلہ کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور اس بات کا قائل تھا کہ انسان مختار کل ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ایک گھڑی کے لیے سر وقد کھڑا ہو جا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر آپؓ نے فرمایا: ذرا تکلیف کر اپنی ایک ٹانگ اٹھا لے۔ وہ ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ آپؓ نے پھر ارشاد فرمایا: اب دوسری ٹانگ بھی ذرا اونچی کر لے مگر خبردار اے بے اِعتبار انسان! گرنا مت۔ وہ یہ سن کر بولا: حضرت! میں اس سے مجبور ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا جا آرام کر۔ جبر وقدر کے مسئلہ کا حل ہو گیا:

ہاں سمجھ انسان ہے مقدور بھی
اور نہیں اس سا کوئی مجبور بھی

یہ سن کر وہ شخص قائل ہو گیا اور حضرت علیؓ کا شکریہ ادا کرتا ہوا چل دیا۔

حضرت معاویہؓ اور شیطان کی فریب کاری

ایک دن صبح کے کھانے کے بعد حضرت معاویہؓ اپنے محل میں قیلولہ (دوپہر کا سونا) فرما رہے تھے۔ نماز ظہر کا وقت آ گیا۔ آپؓ کو ایک شخص نے آ کر جگایا حضرت بیدار ہو جایئے۔ نماز کا وقت ہے۔ مسجد میں جا کر نماز باجماعت پڑھیے۔ آپؓ نے یہ دیکھ کر بڑا تعجب کیا کہ یہ کون ہے جو دربانوں اور پہرے داروں سے چوری چھپے قصر میں داخل ہوا اور پھر میرے دروازہ بند کمرے میں آ گھسا۔ آپؓ اٹھے اور ادھر ادھر تلاش کرنے لگے۔ آخر آپؓ نے دیکھا کہ ایک شخص پس پردہ چھپا کھڑا ہے۔ آپؓ نے اسے جا پکڑا اور پوچھا کہ تو کیا بلا ہے؟ بولا شیطان ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا تو نے مجھے جگایا ہے؟ جواب ملا جی ہاں۔ آپؓ نے پوچھا کیوں؟ شیطان نے کہا تا کہ آپؓ نماز باجماعت کے ثواب سے محروم نہ رہیں۔ تو شیطان تیرا نماز سے کیا کام؟ اس نے جواب دیا کہ آپ کو خبر نہیں کہ میں ہزار ہا سال فرشتوں کے ساتھ مشغول عبادت رہ چکا ہوں۔ نیکی کا اثر ابھی دل میں باقی ہے۔ آپؓ نے فرمایا جھوٹ کیوں بکتا ہے۔ ہمارے بابا آدم سے تو نیکی نہ کی تو ہمارے ساتھ کیوں کرنے لگا۔ تو نسلِ انسانی کا دشمن ہے۔ سچ کہہ کیا بات ہے تو اس وقت میری گرفت میں ہے جب تک ٹھیک نہ بتائے گا نہیں چھوڑوں گا۔ شیطان نے بہت ٹال مٹول کیا مگر آپؓ کو قائل نہ کر سکا۔ آخر اسے بتانا ہی پڑا کہ اے خال المومنین (مسلمانوں کے روحانی ماموں ام المومنین سیدہ ام حبیبہ کے بھائی) میں نے آپؓ کو اس لیے بیدار کیا ہے کہ اگر آپؓ کی نماز فوت ہوگئی تو آپؓ کے سامنے دنیا تاریک و تیرہ ہو جائے گی اور غم و افسوس سے آپؓ کی

آنکھیں اشکباری کر کے طوفان برپا کردیں گی اور آپؓ کی پرتاسف آہ وزاری آپؓ کو سو نمازوں کا ثواب دلائے گی۔ جو کوئی عبادت الٰہی کا خوگر ہو وہ اس کے فوت ہونے پر جس بیقراری کا اظہار کرتا ہے وہ ثواب میں اس کی اطاعت سے بڑھ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی ذرا دیر سے نماز پڑھنے آئے جبکہ مسلمان مسجد سے باہر نکل رہے تھے۔ پوچھا کیا جماعت ہو چکی؟ جواب ملا: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ چکے اب تم کہاں جاتے ہو۔ یہ سن کر اس کے دل سے درد بھری آہ نکلی جس سے اس کے دل کے خون کی بو آئی۔ نمازیوں میں سے ایک شخص نے کہا۔ بھائی یہ آہ مجھے دے دے اور میری نماز تو لے لے۔ چنانچہ سودا ہو گیا اور نماز دے کر اور آہ لے کر بڑی تضرع و نیاز سے گھر واپس آیا۔

رات اسے ہاتف نے کہا تو نے آبِ حیات اور شفا خرید لی۔ اس اختیار و دخول کی حرمت سے تمام خلقت کی نماز قبول ہو گئی:

گر نماز از وقت رفتے مر ترا
ایں جہاں تاریک گشتے بے ضیا
آں تاسف آں فغاں و آں نیاز
در گزشتے از دوصد ذکر و نماز
من حسودم از حسد کردم چنیں
من عدوم کارِ من مکر است وکیں

اے خال المومنینؓ! اگر آپ کی نماز بھی فوت ہو جاتی تو آپؓ کا اس تاسف، اس فغاں اور اس نیاز کا ثواب دو سو کرو نماز سے بڑھ جاتا۔ میں نے گوارا نہ کیا کہ آپؓ کے دل سے بھی وہی آہ نکلے اور ثواب نماز سے بڑھ جائے۔

حضرت معاویہؓ نے کہا اب تو نے سچ کہا ہے مگر اے مکار مکڑے میں مکھی نہ تھا کہ تیرے جال میں پھنس جاتا۔ میں شہباز ہوں۔ تیرے تار مجھے نہیں پھنسا سکتے۔ تو مکھیوں کو شہد سے ہٹا

کر چھاچھ پر لاسکتا ہے ہمیں نہیں لاسکتا۔ تو نے مجھے بیدار نہیں کیا بلکہ سلا دیا ہے۔ تو نے مجھے ایک نیکی کی طرف اس لیے بلایا تا کہ تو مجھے اس سے زیادہ ثواب و نیکی سے باز رکھے:

تو مرا بیدار کردی خواب بود
تو نمودی کشتی ام گرداب بود
تو دریں خیرم ازاں مے خواندی
تاز خیر بہترم مے راندی

بھائیو! حضرت معاویہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح شیطان کے مکروں سے ہمیشہ بچتے رہو۔

ایک چور حضرت فاروق اعظمؓ کی عدالت میں

ایک چور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں موقع واردات پر پکڑا گیا۔ آپ نے جرم ثابت پا کر حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ یہ سن کر اس چور نے عرض کی یا فاروق اعظمؓ میری حالت پر رحم فرمائیں۔ یہ میرا پہلا قصور ہے۔ اس دفعہ معاف فرمادیں۔ میں پھر چوری نہیں کروں گا۔ یہ سن کر صحابہ کرام کو بھی رحم آ گیا اور سب سفارش کرنے لگے کہ اس کے قصور اول سے چشم پوشی فرمائیں۔ اگر پھر اس نے جرم کیا تو اسے قطع ید کی سزا دی جائے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں کبھی یقین نہیں کرتا کہ یہ چوری اس نے پہلی بار کی ہے۔ یہ تو میرے رب ستار کی بے نیازی اور غفاری سے بعید ہے کہ وہ پہلی خطا پر بندے کو رسوا کرے اور اسے توبہ کا موقع نہ دے۔ تم یقین جانو کہ یہ شخص اس سے پہلے کئی دفعہ یہ خطا کر چکا ہے اور رب غنی کی شان ستاری سے فائدہ اٹھا چکا ہے۔ اے جلاد آ اور میرے سامنے اس پر شرعی حد جاری کر یعنی اس کا ہاتھ کاٹ دے۔ چنانچہ اس چور کو قطع دست کی سزا دے دی گئی۔

اللہ تعالیٰ بندے کو کئی بار مہلت دیتا ہے تاکہ وہ توبہ کرلے مگر جب وہ باز نہیں آتا تو پھر اسے رسوا کر دیتا ہے:

بارہا پوشد پئے اظہار فضل
بازگیرد از پئے اظہار عدل
لطف حق با تو مواسا ہا کنند
چانکہ از حد بگزرد رسوا کند
باز آتا ہی نہیں جب بے حیا
کرتا ہے رسوا پھر اسے برملا

حضرت عیاضؒ کا جہادِ اکبر

حضرت عیاضؒ فرماتے ہیں کہ میں شہادت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ستر جہادوں میں بغیر زرہ پہنے شریک ہوا۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں زخم نہ لگے ہوں مگر افسوس کہ شہادت نصیب نہ ہوئی:

در تنم یک جاگہ بے زخم نیست
ایں تنم از تیر چوں پرویزن ایست
تیر خوردن برگلو یا مقتلے
در نیابد جز شہیدے مقبلے

جب میں نے دیکھا کہ شہادت میری قسمت میں نہیں تو میں خلوت میں جا کر چلہ کاٹنے لگا اور اس جہادِ اکبر میں تن ڈال کر لاغر ہونا شروع کر دیا۔ میں اسی حالت میں تھا کہ میرے کان میں غازیوں کے ڈھول کی آواز پڑی۔ میرے نفس نے کہا کہ اٹھ اور جہاد میں شریک ہو جا۔ میں نے کہا ''اے بے وفا خبیث نفس! تو اور جہاد کی صلاح دے۔'' اس میں ضرور کوئی فریب ہے۔ اگر تو سچ نہ کہے گا تو میں ریاضت اور سخت کر دوں گا اور تجھے گھلا گھلا کر ماروں گا۔ نفس نے جواب دیا آپ مجھے اس جگہ ہر روز گبروں (کیڑوں) کی طرح مارتے ہیں۔ دنیا میں کسی کو خبر نہیں کہ مجھے پر کیسی سختی ہو رہی ہے۔ اگر آپ جہاد میں جائیں تو میں ایک زخم کاری سے عذاب سے چھوٹ جاؤں اور دنیا میری مردی اور ایثار کی تعریف کرے۔

میں نے کہا اے کتے نفس! تو منافق کی طرح زندہ رہا اور منافق کی طرح مرنا چاہتا ہے۔ اے ریا کار، ذلیل وخوار نفس! تیری بے ہودگی حد سے بڑھ گئی ہے۔ میں نے عہد کرلیا ہے کہ جب تک جسم میں جان ہے میں خلوت سے باہر نہ نکلوں گا کیونکہ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر انسان جو کرتا ہے وہ دکھاوے کے لیے نہیں کرتا:

جنبش و آرامش اندر خلوتش
جز برائے حق نبودش نیتش

نفس کشی جہادِ اکبر ہے اور جان کشی جہادِ اصغر۔ یہ رستم کا کام ہے اور وہ حیدرؓ کا۔ یہ اس شخص کا کام نہیں ہے جو ایک چوہے کی جنبش سے ہوش گم کردے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھے رہیں۔ ایسا شخص صوفی نہیں کہلا سکتا جو سوئی چبھنے کی تاب نہ لا سکے اور تیغ زنی کی آرزو رکھے۔ اس کو صوفی نہ سمجھو بلکہ نقشِ بے جان سمجھو۔ ایسے ہی صوفیوں نے صوفیائے کرام کو بدنام کر رکھا ہے:

نقش صوفی باشد او را نیست جاں
صوفیاں بدنام ہم زیں صوفیاں
بر در و دیوار جسم گل سرشت
حق زغیرت نقش صد صوفی نوشت

باب چہارم

مولانا رومؒ کے ارشاداتِ عالیہ وملفوظات حکیمہ

ارتقاء کی حقیقت ومعنویت

یہ کس قدر مہربانی ہے کہ مولانا تشریف لائے۔ مجھے اس کی توقع نہ تھی اور مجھے یہ وہم تک نہ تھا۔ میں اس کے لائق کہاں۔ مجھے چاہیے کہ دن رات ہاتھ باندھے ان کے نوکروں اور خادموں کے زمرہ اور حلقہ میں رہوں۔ ابھی میں اس قابل نہیں ہوں، یہ ان کی مہربانی ہے۔

فرمایا منجملہ ان باتوں کی یہ ایک ہے کہ تمھاری ہمت بلند ہے۔ ہر چند کے تمھارا مرتبہ نہایت بلند ہے اور تم بڑے بڑے کاموں میں مشغول ہو اپنی بلندئ ہمت کی وجہ سے تم اپنے آپ کو قاصر سمجھتے ہو اور موجودہ صورتحال سے خوش نہیں ہو اور تم بے شمار کام اپنے آپ پر فرض سمجھتے ہو۔ اگر چہ ہمارا دل ہمیشہ ان کی خدمت میں تھا۔ ہم نے دیکھا کہ صورت دیکھنے کا شرف بھی حاصل کریں۔ کیونکہ صورت بھی بڑا اعتبار رکھتی ہے۔ اعتبار کا مقام مغز کے ساتھ مشارکت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ بے مغز چیز پھولتی پھلتی نہیں۔ چھلکے کے بغیر بھی کسی چیز کو نشوونما نہیں ہوتی۔ اگر چہ بغیر چھلکے کا دانہ زمین میں بودیا جائے تو وہ نہیں اگتا۔ اگر اسے چھلکے سمیت بودیا جائے تو اگ آتا ہے۔ اور وہ بڑا درخت بن جاتا ہے۔ پس اس لحاظ سے جسم بھی ایک عظیم اصل ہے اور ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی کام انجام نہیں پاسکتا اور مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

ایک درویش ایک بادشاہ کے پاس گیا۔ بادشاہ نے اس سے کہا ”اے زاہد!“ اس نے

جواب دیا۔ ''زاہد تو ہے'' کہا ''میں زاہد کیسے ہوں؟ کہ دنیا کا سب کچھ میری ملکیت ہے۔''
بولا، نہیں۔ تو عکس دیکھتا ہے۔ دنیا، آخرت اور تیرا ملک سب میری ملکیت ہیں اور دنیا
میرے تصرف میں ہے۔ تو ہے کہ ایک لقمہ اور چغہ پر قانع ہے:

فاینما تولو افثم وجه الله (سورۃ بقرہ: جدھر منہ کرو، ادھر ہی اللہ کا چہرہ!)

اللہ کا چہرہ ہی رائج و مجریٰ ہے۔ صرف وہی ہے جو منقطع ہونے والا نہیں اور باقی رہنے
والا ہے۔ عاشقوں نے اپنے آپ کو اس چہرہ پر فدا کر دیا ہے۔ وہ اس کے عوض کچھ نہیں
مانگتے۔ باقی لوگ ڈھور ڈنگروں کی طرح ہیں۔ فرمایا اگرچہ وہ ڈھور ڈنگر ہیں مگر انعام کے
مستحق ہیں۔ اور اگرچہ وہ گھوڑوں کی گھاس ہیں لیکن میرِ اصطبل کے قبول کردہ ہیں۔ اگر وہ
چاہے تو اس گھاس کو اپنے طویلے خاص میں لے جائے۔ جیسے اس کا آغاز عدم تھا، ویسے ہی
اسے اب وجود میں لے آئے۔ وجود کے طویلہ سے اسے جمادات میں لے آئے اور
جمادات کے طویلہ سے اسے نباتات کے طویلہ میں لے آئے۔ نباتات سے حیوانات میں،
حیوانات سے انسانوں میں اور انسانوں سے فرشتوں میں لے آئے:

الٰی مالا نهاية — وہاں تک جہاں کی انتہا نہیں۔

پس یہ سب اس لیے ہوا تا کہ تو اقرار کرے کہ اس جنس کے لیے اس کے بے شمار
طویلے ہیں، ایک دوسرے سے بڑھ کر:

لتركبن طبقا عن طبق فما لهم لا يؤ منون . (انشقاق:١٤) — تم لوگ چڑھتے رہو گے درجہ بدرجہ۔ ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے؟

یہ اس لیے ظاہر کر دیا گیا کہ دوسرے طبقات جو آنے والے ہیں تو ان کا اقرار کرے۔
یہ اظہار اس لیے نہیں کیا کہ تو انکار کرے۔ اور کہہ دے کہ ''صرف یہ ہے''۔ ایک استاد اس
لیے اپنی صنعت اور فرہنگ کی نمائش کرتا ہے کہ اس کے معتقد ہو جائیں۔ اور ان دوسرے
فرہنگوں پر جو اس نے انھیں دکھائے ہیں، ان کا بھی اقرار کرنے لگیں اور اس پر ایمان لے

آئیں۔اسی طرح ایک بادشاہ کسان کوخلعت اور صلہ دیتااورنوازتا ہے کہ اس سے اور بہت سی باتوں کی توقع کرے اور وہ اپنی امید کا دامن اور پھیلائے۔بادشاہ اس لیےنوازش نہیں کرتا کہ کسان کہہ دے: ''بس یہی کچھ ہے۔بادشاہ اورانعام نہیں دے گا۔اس نے اسی پر بس کردی ہے۔'' بادشاہ کواگر معلوم ہو جائے کہ کسان ایسا کہے گااورایسا سمجھے گا تو وہ اسے ہرگز انعام نہ دے۔

زاہد وہ ہے جو آخرت کودیکھتا ہےاوردنیادار جانوروں کی طرح کھانے کی چیزوں پر جو گھاس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں نظر رکھتے ہیں۔مگر وہ لوگ جو خاص تر اور عارف ہیں۔ وہ آخرت پرنظر رکھتے ہیں۔نہ آخر (دنیاکےتوشہ) پر۔ان کی نظراول پر پڑتی ہے۔وہ ہر کام کا آغاز جانتے ہیں۔جیسے گندم کی حقیقت کا جاننے والا گندم بوکر جانتا ہے کہ گندم اگے گی۔ اس نے آغاز سے انجام کو دیکھا۔اسی طرح جواور چاول وغیرہ۔جس نے اوّل کو دیکھا اس کی نظرآخر پرنہیں۔کیونکہ اوّل ہی سے آخر معلوم ہوگیا۔یہ لوگ نادر ہیں جو آخرکو دیکھتے ہیں درمیانہ درجہ کےلوگ ہیں۔یہ جو آخر میں ہیں یہ چوپائے اورڈھورڈنگر ہیں۔

ہر کام میں درد آدمی کی راہنمائی کرتا ہے۔جب تک اس کے دل میں اس کام کے لیے لالچ اورمحبت پیدا ہوکراس کے اندر درد پیدا نہ کردیں،وہ اس کام کا قصد ہی نہیں کرتا اور بغیر درد کے اسے میسر بھی نہیں آتا۔خواہ دنیا ہو یا آخرت۔سوداگری ہو یا بادشاہی۔علم اور خواہ نجوم۔جب تک حضرت مریم کودردِزہ شروع نہ ہوا،وہ درخت کے پاس نہ گئیں۔

فجآءھا المخاض الی جذع النخلة. (سورۃ مریم:ع۲) دردِزہ انھیں درخت خرما کے پاس لے پہنچا۔

انھیں وہ درد درخت کے پاس لے آیا۔اور درخت خشک میوہ دار بن گیا۔جسم مریم کی طرح ہےاور ہم میں سے ہر آدمی حضرت عیسیٰؑ کی طرح ہے۔اگر ہمیں درد پیدا ہوتا ہےتو ہمارا عیسیٰ جنم لیتا ہے۔اوراگر درد پیدا نہیں ہوتا تو عیسیٰ بھی جس چھپے راستے سے آیا پھراپنے اصل سے مل جاتا ہےاور ہم اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔اور بے بہرہ رہتے ہیں۔

انسانی ظرف مولانا رومؒ کی نظر میں

اتابک کا بیٹا مولانا کے پاس آیا۔ مولانا نے فرمایا، تیرا باپ ہمیشہ حق میں مشغول ہے۔اس کا اعتقاد غالب ہے، اوراس کی باتوں سے معلوم ہوا ہے کہ ایک دن روم کے کافر کہتے تھے۔ہم بیٹی تاتاریوں کو دیں، تاکہ ہمارااوران کا دین ایک ہو جائے۔اور یہ نیا مذہب جسے اسلام کہتے ہیں، مٹ جائے۔ میں نے کہا یہ دین کیسے ایک ہوسکتا ہے؟ دین ہمیشہ دو تین ہوتے رہتے ہیں۔اوران کے درمیان لڑائی جھگڑا قائم رہا ہے۔تم دین کوایک کیسے کر سکو گے۔

دنیا کا ایک ہی مذہب تو وہیں ہوگا یعنی قیامت میں۔لیکن یہ جگہ جسے دنیا کہتے ہیں یہاں ممکن نہیں۔ کیونکہ یہاں ہر چیز کی مراداور خواہش مختلف ہے۔ یہاں سب کا ایک ہونا ممکن نہیں۔لیکن قیامت کو یہ ہوسکتا ہے۔کیونکہ ساری مخلوقِ خداایک جگہ موجود ہوگی۔سب کے سب ایک ہی طرف دیکھیں گے۔ یک گوش اور یک زبان ہوں گے۔آدمی میں کئی چیزیں ہیں۔ چوہے اور پرندے کو لیجئے۔ پرندہ پنجرے کواوپر لے جاتا ہے اور چوہا اسے نیچے کی طرف کھینچتا ہے۔آدمی میں سو ہزار مختلف جانور ہیں۔لیکن یہ سب جب وہاں جائیں گے جہاں چوہا، چوہا نہ رہے گا اور پرندہ، پرندہ نہ رہے گا، تو سب ایک ہو جائیں گے۔کیونکہ مطلوب نہ اوپر ہے اور نہ نیچے۔جب مطلوب ظاہر ہو جائے نہ اوپر رہا نہ نیچے۔ایک شخص کی کوئی چیز گم ہوگئی، وہ اسے کبھی دائیں ڈھونڈتا ہے، کبھی بائیں طرف۔ وہ آگے دیکھتا ہے، پیچھے دیکھتا ہے۔جب وہ چیز مل گئی، تو وہ نہ اوپر تلاش کرتا ہے نہ نیچے، نہ دائیں طرف ڈھونڈتا ہے نہ بائیں طرف۔ نہ آگے تلاش کرتا ہے، نہ پیچھے۔پس اس روز سب خلقِ خدا کی نظر، زبان کان، ہوش ایک ہو جائیں گے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے دس آدمی ایک باغ یا دکان کی ملکیت میں شریک ہوں، ان کی بات ایک ہوگی۔ ان کا غم ایک ہوگا۔ ان کی مصروفیتیں ایک ہوں گی۔ چونکہ ان کا مطلوب ایک ہے، ان کی ہر چیز ایک ہوگی۔ پس قیامت کے دن جب سب کا واسطہ خدا سے پڑے گا۔ یہ سب ایک ہو جائیں گے۔ دنیا میں ہر شخص انھی معنوں میں کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے۔ کوئی عورت کی محبت میں ہے۔ کوئی مال کی محبت میں۔ کوئی اکتساب میں ہے اور کوئی علم میں۔ سب کا اعتقاد یہ ہے کہ میرا علاج، میرا ذوق، میری خوشی، میری راحت اسی میں ہے۔ اور یہی خدا کی رحمت ہے، جب اس جگہ جاتا ہے، تلاش کرتا ہے۔ مگر اپنا علاج اور راحت نہیں پاتا تو واپس لوٹتا ہے۔ کچھ عرصہ انتظار کرتا ہے اور پھر کہتا ہے، وہ ذوق اور رحمت جستجو سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے پوری جستجو نہیں کی۔ پھر تلاش کرتا ہوں۔ پھر ڈھونڈتا ہوں۔ لیکن پھر بھی اسے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ یہاں تک کہ کسی وقت رحمت بے پردہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اب اسے سمجھ آتی ہے کہ جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ قیامت سے پہلے دیکھ لیتے ہیں۔ امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

جب حشرِ اجساد ہوگا اور قیامت برپا ہو جائے گی، ہمارے یقین میں اضافہ نہ ہوگا۔

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک قوم اندھیری رات میں ایک اندھیرے گھر کے اندر نماز پڑھ رہی ہے۔ کسی کا منہ کسی طرف ہے اور کسی کا منہ کسی طرف۔ جب صبح کی روشنی نمودار ہوگی، تو سب کے سب اپنا منہ ایک ہی طرف پھیر لیں گے۔ لیکن ان میں سے جن کے منہ پہلے ہی قبلہ کی طرف تھے۔ اس رات وہ منہ کدھر پھیریں گے؟ پس جب سب نے قبلہ کی طرف منہ کرلیا، تو ان کا منہ پہلے ہی قبلہ کی طرف تھا۔ پس ان کا منہ اسی طرف ہے اور وہ ہر دوسری طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے، قیامت ان کے سامنے موجود ہے۔ اور حاضر ہے۔ بات تو ختم ہونے والی نہیں۔ لیکن طلب رکھنے والوں کے ظرف کے مطابق آیا ہے کہ:

وان من شیٍٔ الا عندنا خزائنهٗ وما نُنَزِّ لہٗ الا بقدرِ معلوم . (سورہ حجرع۲) کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے ہاں نہ ہوں ۔ لیکن ہم اس میں سے ایک مقدار معین کے مطابق اتارتے رہتے ہیں ۔

حکمت بارش کی طرح ہے ۔ یہ اپنی کان میں بے انتہا ہے ۔ لیکن وہ مصلحت کے مطابق آتی ہے ۔ سرما میں، بہار میں، گرما میں، خزاں میں مصلحت کے مطابق زیادہ یا کم آتی ہے ۔ لیکن جس جگہ سے وہ آتی ہے ۔ وہاں اس کی کوئی حد نہیں ہوتی ۔ شکر کو کاغذ میں لپیٹتے ہیں یا عطار دوائیوں کو کاغذ میں باندھتے ہیں ۔ لیکن یہ شکر صرف اتنی ہی نہیں ہوتی جتنی کہ کاغذ میں لپیٹی گئی ۔ شکر کی کانیں اور دواؤں کی کانیں بے حد ہیں ۔ ان کا کوئی شمار نہیں ۔ یہ کاغذ میں کیسے سما سکتی ہیں ۔ بعض لوگوں نے طعنہ دیا کہ قرآن آیت آیت ہو کر کیوں نازل ہوتا ہے؟ پوری سورت کی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی ؟ حضور سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، یہ احمق لوگ کیا کہتے ہیں ۔ اگر پوری سورت مجھ پر بیک وقت نازل ہوتو میں گداز ہو جاؤں اور باقی نہ رہوں ۔ کیونکہ واقفیت رکھنے والا آدمی تھوڑے سے بہت زیادہ سمجھ جاتا ہے ۔ ایک چیز سے بہت سی چیزیں اور ایک سطر سے ڈھیروں کتابیں ۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک جماعت بیٹھی ہے اور ایک حکایت سن رہی ہے ۔ لیکن ان میں وہ شخص جو تمام کام جانتا ہے اور جو کچھ کہ واقع ہوا وہ ایک اشارہ ہی سے سب کچھ سمجھتا ہے، اس کا چہرہ کبھی خوف کے مارے زرد ہو جاتا ہے اور کبھی فرطِ جوش سے سرخ ہو جاتا ہے ۔ اس کا حال کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ ۔ لیکن باقی اہلِ مجلس صرف اتنی بات ہی سمجھتے ہیں جتنی کہ انھوں نے سن لی ۔ کیونکہ وہ پورے حال سے واقف نہیں ۔ جو پورے حال سے واقف تھا، اس نے ان کے مقابلے میں بہت کچھ سمجھ لیا ۔

اب ہم اصل مطلب کی طرف آتے ہیں ۔ تو عطار کے پاس جائے تو اس کے پاس شکر بہت ہے ۔ لیکن وہ یہ دیکھتا ہے کہ تو پیسے کتنے لایا ہے ۔ ان پیسوں کے مطابق وہ تجھے شکر دیتا ہے ۔ پیسے یہاں ہمت اور اعتقاد ہیں ۔ ہمت اور اعتقاد کے مطابق بات ہوتی ہے ۔

جب تو شکر خریدنے کے لیے آتا ہے، تو دیکھتے ہیں کہ تیری جیب میں کتنی نقدی ہے۔ نقدی کے مطابق پیمانہ سے شکر ناپ کر دیتے ہیں۔ ایک پیمانہ یا دو پیمانے۔ لیکن اگر تو شکر لادنے کے لیے اونٹوں کی قطاریں اور نقدی کے بے شمار خزانے لایا ہے تو کہیں گے کہ بھئی بڑے پیمانے لاؤ۔ اسی طرح بعض آدمیوں کو دریا بھی تھوڑا ہوتا ہے۔ اور بعض آدمیوں کو چند قطرے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے لیے مضر ہوتا ہے۔ یہ بات صرف عالمِ معنی، علم اور حکمت ہی میں نہیں، ہر چیز کا یہی حال ہے۔ مال، زر، معدنیات، بے حد اور بے پایاں ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق ملتا ہے۔ کیونکہ زیادہ کی وہ تاب نہیں لاسکتا اور پاگل ہو جاتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ عاشقوں میں سے مجنوں، فرہاد جو پہاڑوں اور جنگلوں میں خاک چھانتے پھرے، جب عورت کے عشق میں ان کی شہوت ان کی طاقت سے بڑھ گئی، تو وہ اپنے آپ میں نہ رہے۔

اسی طرح کیا تجھے معلوم نہیں کہ فرعون کو جب ملک اور مال زیادہ دے دیا گیا تو اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ **وان من شیٔ الا عندنا خزائنه**۔ اچھی اور بُری کوئی چیز ایسی نہیں جو ہمارے پاس اور ہمارے خزانے میں بے حد اور بے پایاں نہ ہو۔ لیکن ہم ہر چیز انسان کے ظرف کے مطابق اسے دیتے ہیں کیونکہ مصلحت اسی میں ہے۔

ہاں یہ شخص معتقد تو ہے، لیکن وہ اپنے اعتقاد کو نہیں جانتا۔ جیسے ایک بچہ روٹی کا معتقد ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس چیز کا معتقد ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نامیات میں سے درخت پیاس کی وجہ سے زرد اور خشک ہو جاتا ہے، مگر وہ نہیں جانتا کہ پیاس کسے کہتے ہیں۔ آدمی کا وجود ایک جھنڈے کی طرح ہے۔ جھنڈے کو پہلے ہوا میں لہراتے ہیں۔ اس کے بعد ہر طرف سے عقل، فہم، غصہ، غضب، حلم، کرم، خوف، امید اور بیشمار حالات اور ان گنت صفات کو بروئے کار لا کر لشکروں کو اس جھنڈے کے نیچے بھیج دیتا ہے۔ جو شخص بھی اس صورت حال کو دور سے دیکھتا ہے، اسے اکیلا جھنڈا ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جو شخص زیادہ نزدیک آ کر دیکھتا ہے، اسے جھنڈے کے نیچے کیا کیا موتی اور کیا کیا معنی نظر آتے ہیں۔

ایک شخص آیا، مولانا نے پوچھا۔تو کہاں تھا؟ ہم تیرے مشتاق تھے تو دور کیوں رہا؟ بولا اتفاق ایسا ہی ہوگیا۔فرمایا ہم نے بھی دعا کی تھی کہ یہ اتفاق درمیان میں پلٹ جائے اور زائل ہو جائے۔وہ اتفاق جو ہجر کا باعث بنتا ہے، نازیبا ہے۔واللہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔لیکن خدا سے ہر چیز کی نسبت نیک ہے۔لیکن ہم سے نہیں۔سچ کہتے ہیں، خدا سے سب کی نسبت نیک اور بہ تمام وکمال ہے۔لیکن ہم سے نہیں۔زنا، پاکبازی، بے نمازی، نماز، کفر، اسلام، شرک، توحید کی خدا سے نسبت نیک ہے۔لیکن ہم انسانوں سے زنا، چوری، کفر، شرک کی نسبت بد ہے۔توحید، نماز، خیرات کی نسبت نیک ہے۔یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بادشاہ کے ملک میں قید خانہ، پھانسی کا پھندا، خلعت، مال، املاک، حشم، شادی، طبل، علم سبھی کچھ ہوتا ہے۔بادشاہ سے ان چیزوں کی نسبت نیک ہے۔خلعت اس کے ملک کا کمال ہے۔پھانسی کا پھندا، قتل اور قید خانہ بھی اس کے ملک کا کمال ہے اور اس کے ساتھ ان سب کی نسبت کمال ہے۔لیکن جہاں تک رعایا کا تعلق ہے، خلعت اور پھانسی کا پھندا کیسے ایک ہو سکتے ہیں۔گویا جو چیز بادشاہ کے لیے کمال کا درجہ رکھتی ہے وہ چیز اسی بادشاہ کی رعایا کے حق میں کمال نہیں رکھتی۔انسانوں کے ظرف کے مطابق چیزوں کی حالت اور قدر و قیمت بدل جاتی ہے۔ان کی قدر و قیمت کا تعین انسانی ظرفوں پر موقوف ہوتا ہے۔

روح کیا ہے اور نفس کیا ہے؟

مولانا نے امیر سے فرمایا، ہم تمھارے بہت مشتاق ہیں۔ چونکہ میں جانتا ہوں تم دنیا کی بہتری کرنے میں مشغول ہو۔تم سے دوری کی زحمت برداشت کررہا ہوں۔امیر نے کہا یہ مجھ پر واجب تھا۔ پریشانی جاتی رہے تو اس کے بعد میں آپ کے پاس حاضر ہوں۔مولانا نے فرمایا، کوئی فرق نہیں۔تمھارے لیے سب ایک جیسا ہے، تمھیں وہ لطف حاصل ہے کہ زحمتیں تمھارے لیے گویا رحمتیں ہیں۔لیکن جب میں نے جانا کہ آج آپ خیرات اور دوسرے نیکی کے کاموں میں مشغول ہیں تو آپ کی طرف رجوع ہوا۔اس گھڑی ہم یہ بحث کرتے ہیں کہ ایک مرد کے اہل وعیال ہیں اور دوسرا ایک مرد ایسا ہے جس کے اہل وعیال نہیں ہیں۔عیالدار سے اس کا اہل وعیال لے کر اس دوسرے مرد کو دے دیے جائیں، تو ظاہر دار لوگ کہتے ہیں، عیالدار سے لے کر اہل وعیال اسے دے دیے جس کے پاس اہل و عیال نہ تھے۔ جب تو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ دراصل اس اہل وعیال کا وہ خود مالک نہیں۔ یہ ایسا ہے کہ اہل دل شخص میں جوہر ہوتا ہے۔کسی پوشیدہ مصلحت کی وجہ سے وہ کسی آدمی کو پیٹتا ہے۔اس کے ناک اور منہ کو توڑ دیتا ہے۔سب لوگ کہتے ہیں کہ مار کھانے والا مظلوم ہے۔ لیکن تحقیق کرنے پر معلوم ہوگا کہ مظلوم دراصل مارنے والا ہے۔اور پٹنے والا ظالم ہے۔ کیونکہ مارنے والا صاحب جوہر ہے۔جو کام اس نے کیا وہ دراصل خدا نے کیا اور خدا کو ظالم نہیں کہتے۔ جیسا حضور سرور کائنات ﷺ نے کشت وخون کیا اور غارت گری کی۔اس کے باوجود ظالم وہ دشمن ہی تھے۔اور حضور ﷺ مظلوم تھے۔مثلاً مغرب کا رہنے والا ایک آدمی مغرب میں مقیم ہے اور وہ صاحب جوہر ہے اور مشرق کا رہنے والا ایک شخص مغرب میں آیا۔ مسافر وہ مغربی ہے لیکن جو شخص مشرق سے آیا، کیا وہ مسافر ہے؟ ساری دنیا ایک گھر سے زیادہ

نہیں۔ اگر کوئی آدمی گھر کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں چلا جائے، تو وہ مسافر نہیں کہلاتا کیونکہ آخر وہ گھر ہی میں موجود ہے۔ لیکن وہ مغربی شخص جو صاحب جوہر ہے، گھر سے باہر آئے تو مسافر ہے، کہتے ہیں:

الاسلام بدأ غريباً (حديث) اسلام کی ابتداء غربت سے ہوئی۔

یہ نہیں کہا گیا:

المشرقي بدأ غريباً مشرق کی ابتدا غربت سے ہوئی۔

اسی طرح حضور سرورِ کائنات ﷺ نے جب شکست کھائی تو مظلوم تھے اور جب انھوں نے شکست دی، اس وقت بھی مظلوم حضور ﷺ ہی تھے۔ کیونکہ دونوں حالتوں میں وہ حق پر تھے۔ اور مظلوم وہ ہے جس کے ہاتھ میں صداقت ہو۔ حضور سرورِ کائنات ﷺ کو اسیروں کے متعلق دلسوزی تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی خاطر وحی نازل کی کہ اے رسول ﷺ ان اسیروں سے کہہ دے کہ اس قید و بند کی حالت میں اگر تم اپنی نیت کو بخیر کرلو تو خدا تعالیٰ تمھیں رہائی دے گا۔ اور جو کچھ تم سے چھن گیا ہے وہ تمھیں دوبارہ دے گا۔ بلکہ اس کو دگنا تگنا کر کے دے گا۔ اپنی بخشش اور رضا سے وہ تمھیں دو خزانے دے گا۔ ایک دنیا کا خزانہ جو تم نے کھویا ہے اور دوسرا آخرت کا۔

امیر نے سوال کیا، جب بندہ عمل کرتا ہے۔ تو وہ توفیق اور خیر کے ذریعے ہوتا ہے یا خدا کی مہربانی سے؟ فرمایا، خدا کی مہربانی سے اور توفیق بھی حق ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ اپنے انتہائی لطف و کرم سے دونوں میں اضافہ فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ دونوں تجھ سے ہیں:

جزاءً بما كانوا يعملون. (احقاف:۲) جو کچھ انھوں نے کیا اس کا بدلہ۔

کہا چونکہ خدا تعالیٰ کو اس میں لطف آتا ہے۔ پس جو شخص حقیقی طلب رکھتا ہے، پالیتا ہے۔ فرمایا لیکن یہ بغیر سردار کے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والا واقعہ ہے کہ جب وہ لوگ آپ کے مطیع تھے، دریائے نیل میں راستے پیدا ہو گئے اور دریا میں سے گرد

اٹھنے لگی۔ اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور گئے۔ پھر جب انھوں نے اپنے سردار کی مخالفت کی تو چالیس سال تک بیابانوں میں بھٹکتے پھرے سورہ مائدہ میں ارشادِ ربانی ہے:

وہ چالیس سال تک زمین میں بھٹکتے رہے۔

اور اس زمانہ کا سرداران کی اصطلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے، وہ دیکھے کہ وہ اس کے مطیع ہیں اور احکام بجالاتے ہیں۔ مثلاً جب سپاہی امیر کی خدمت میں مطیع اور فرمانبردار ہوتے ہیں تو وہ بھی اپنی عقل کو ان کی بھلائی کے کام سوچنے میں لگائے رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ اس کے مطیع نہ رہیں تو وہ کس طرح ان کا تدارک کرسکتا ہے۔ اور اپنی عقل کو کیسے ان کی بھلائی میں مصروف رکھ سکتا ہے۔

پس سمجھ لے کے آدمی کے جسم میں عقل ہمیشہ امیر کی مانند ہے۔ جب تک جسم کی رعایا اس کی مطیع رہتی ہے۔ اس کے سب کام اصلاح پاتے رہتے ہیں۔ لیکن جب جسم عقل کے تابع نہیں رہتا تو فساد رونما ہوجاتا ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ شرابی آدمی جب نشہ میں چور ہوتا ہے تو رعایائے وجود یعنی ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان کیا کیا فساد برپا کرتے ہیں۔ دوسرے دن ہوشیار ہونے پر وہ کہتا ہے کہ میں نے کیا کیا! میں نے کیوں اس طرح بکواس کی، اور کیوں گالیاں دیں۔ پس اصلاح کا وقت وہی ہوتا ہے جب بستی میں سردار موجود ہو۔ اور یہ اس کے مطیع ہوں۔ اب عقل بعض وقت اس رعایائے اعضاء کی اصلاح کے لیے سوچ بچار کرتی ہے، جو اس کے زیرِ فرمان ہیں۔ مثلاً اس نے سوچا کہ میں جاؤں۔ یہ اس وقت ہی ہوسکتا ہے کہ پاؤں اس کے زیرِ فرمان ہوں۔ ورنہ وہ سوچتی ہی نہیں۔ اب اسی طرح جسم میں عقل امیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سارے وجود جسے دنیا کہتے ہیں، سب کے سب اپنی عقل، دانش، نظر اور علم سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ سب مل کر ایک جسم ہیں اور ان میں مجموعی عقل امیر ہے۔ دنیا کے جسم اگر اس امیر کے تابع نہیں رہتے تو ان کی حالت پر ہمیشہ پریشانی طاری رہتی ہے۔ اب جبکہ وہ مطیع ہوجاتے ہیں تو جو کچھ مجموعی عقل کہتی ہے، یہ کرتے ہیں۔ اور وہ اپنی عقل کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اپنی عقل

سے اسے نہ سمجھ سکیں۔ چاہیے کہ وہ اس کے مطیع رہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک لڑکے کو درزی کی دکان پر شاگرد بنا کر بٹھاتے ہیں، تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں استاد کا مطیع ہو۔ اور چاہیے کہ استاد کے حکم کا پابند ہو جائے۔ خداوند تعالیٰ سے میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایسی حالت پیدا کر دے گا جو صرف اس کی عنایت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور جو لاکھوں کوششوں کی زد سے بالا ہے:

شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

یہ بات اور وہ بات ایک ہی ہے کہ:

جب اس کی عنایت ہو تو وہ عنایت لاکھ کوششوں کا کام سرانجام دیتی ہے۔

اور کوشش کی افزونی اچھی اور مفید چیز ہے۔ لیکن عنایت کے مقابلہ میں کوشش کیا حیثیت رکھتی ہے۔

پروانے نے پوچھا کہ عنایت سے کوشش پیدا ہوتی ہے؟ فرمایا کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ جہاں عنایت ہو وہاں کوشش آ ہی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا کوشش کی کہ پنگھوڑے ہی میں کہا:

میں خدا کا بندہ ہوں۔ مجھے پر کتاب اتری ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ ان کی تعریف کی۔ کہا حضور سرورِ کائنات ﷺ بغیر کوشش کے نبی ہوئے، فرمایا:

سو جس کا سینہ اللہ اسلام کے لیے کھول دے۔

پہلے فضل ہے، جب انسان گمراہی سے نکل کر بیدار ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فضل اور اس کی عطائے محض ہوتی ہے۔ ورنہ اس فضل و جزا کے بعد حضورؐ کے دوستوں کے ساتھ یہی کچھ کیوں نہ ہوا جو حضورؐ کے قریب تھے۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے آگ کی چنگاری کو دتی ہے، اس چنگاری کا آغاز عطا ہے۔ اس فضل و جزا کے بعد جب اس چنگاری کے سامنے تو نے روئی رکھ دی تو اس کی پرورش کی اور اسے بڑھایا۔ آدمی کا آغاز خاموشی اور

ضعف ہی ہے۔جیسا کہ:

خلق الانسان ضعيفاً ، (نساء:۵)   انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جیسا کہ پتھر اور لوہے سے نکل کر آگ کی چنگاری جلے ہوئے کپڑے پر گرتی ہے۔اس آگ کی ابتدا بہت کمزور ہے۔لیکن جب اس کمزور آگ کی پرورش کرتے ہیں تو یہ ایک جہان بن جاتی ہے اور ساری دنیا کو جلا سکتی ہے اور وہی چھوٹی سے آگ بہت بڑی بن جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

بے شک تمھارا خلق اعلیٰ درجہ کا ہے۔

میں نے کہا مولانا آپ کو بہت بڑا دوست سمجھتے ہیں۔فرمایا میری آمد نہ تو دوستی کی وجہ سے ہے اور نہ گفتگو کی خاطر۔جو زبان پر آتا ہے میں کہہ دیتا ہوں۔گر خدا چاہے تو اس تھوڑی سے بات سے نفع دے دیتا ہے۔اور اسے آپ کے سینے کے اندر قائم کر دیتا ہے۔اور بڑا نفع دیتا ہے۔اور اگر خدا نہ چاہے تو لاکھ باتیں سنو اور یاد رکھنے کی کوشش کرو۔ان میں سے ایک بھی دل میں نہ ٹھہرے گی۔ہر بات ہوا میں اڑ جائے گی،اور فراموش ہو جائے گی۔ایسے ہی جیسے آگ کی چنگاری جلے ہوئے کپڑے پر گری۔اگر خدا چاہے تو یہی چنگاری وسعت پاتی، اور بہت بڑی آگ بن جاتی ہے۔اگر خدا نہ چاہے تو چنگاری جلے ہوئے کپڑے تک پہنچ کر بس ہو جاتی ہے۔اور کوئی اثر نہیں کرتی:

وللّٰہ جنود السمٰوات والارض.   آسمان اور زمین میں خدا ہی کے لشکر ہیں۔
(سورۂ فتح:ع ۱)

یہ باتیں بھی خدا کی فوج ہیں۔یہ قلعوں کو خدا کے دستور کے مطابق فتح کرتی اور اس پر قابض ہوتی ہیں۔اگر وہ کہے کہ اتنے ہزار سوار فلاں قلعہ پر چڑھائی کریں۔وہاں پہنچیں لیکن قلعہ پر قبضہ نہ کریں تو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔اور اگر وہ ایک ہی سوار سے کہہ دے کہ تم اس قلع کو فتح کرلو،اور اپنے قبضے میں۔لے آؤ تو وہ ایک سوار ہی اس قلعہ کو فتح کر کے اس پر قابض ہو جاتا ہے۔مچھر سے نمرود پر حملہ کرا دیتا ہے۔اور اس سے نمرود کو ہلاک کرا دیتا

ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

استوی عند العارف الدانق و الدینار و الاسد الهرة. عارف کے نزدیک دانق اور دینار اور شیر اور بلی برابر ہیں۔

اگر خداوند تعالیٰ برکت دے تو ایک آنہ چار لاکھ روپے کا کام دے جاتا ہے۔ اور اگر چار لاکھ روپے میں سے برکت اٹھ جائے تو وہ ایک آنہ کا کام بھی نہیں دے سکتے۔ ایسے ہی اگر بلی کسی پر حملہ کرے تو اسے ہلاک کر دیتی ہے، جس طرح مچھر نے نمرود کو ہلاک کر دیا تھا۔ اگر خدا چاہے تو شیر کو درویشوں کے لیے سواری کا جانور بنا دے، تو شیر درویشوں کے سامنے کانپنے لگتا ہے۔ چنانچہ بعض درویش شیر پر درحقیقت سوار ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم پر آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ اور وہ سلامت رہے۔ اور وہ آگ سبزہ وگلزار بن گئی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ خدا نے آگ کو اجازت نہ دی تھی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کو جلائے۔

حاصل کلام یہ کہ جب یہ جانتے ہیں کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ ان کے سامنے سب کچھ یکساں ہے۔ میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ آپ یہ باتیں بھی اپنے دل سے سنیں کہ دل سے باتیں سننا بھی مفید ہے۔ اگر باہر سے ہزار چور بھی آجائیں تو وہ ان موتیوں کو چرا کر نہیں لے جا سکتے۔ جب تک یہاں سینہ کے اندر ان کا دوست موجود نہ ہو جو ان کو اندر بلانے کے لیے دروازہ کھول دے تو باہر سے لاکھ باتیں کہتا رہے جب تک ان کی تصدیق کرنے والا سینے کے اندر موجود نہ ہو ان کا کچھ فائدہ نہیں۔ یہ ایسے ہی ہیں جیسے بیج کے اندر آبداری نہ ہو۔ اس پر سے پانی کے ہزار طوفان بھی گزر جائیں تو نہیں وہ پھوٹے گا، اور نہ اس سے درخت پیدا ہو سکے گا۔ بیج کے اندر پہلے آبداری کا ہونا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ باہر کی چیزوں کو مدد دے سکے۔

اب اصل قابلیت وہ ہے جو نفس میں ہے۔ نفس اور روح دو مختلف چیزیں ہیں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ نفس انسان کو خواب میں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے۔ اور روح جسم ہی میں

رہتی ہے۔لیکن یہ نفس بن جاتا ہےاور دوسری چیز ہو جاتا ہے۔پس امیر المومنین حضرت علی نے جو کچھ کہا:

من عرفه نفسهٗ فقد عرف ربه. جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے خدا کو پہچان لیا۔

یہ نفس ہی کے متعلق کہا ہے۔روح کے متعلق نہیں کہا۔اور اگر ہم کہیں کہ یہ نفس کے متعلق کہا ہے یہ عقل مندی نہیں۔اور اگر ہم اس نفس کی شرح کریں تو وہ اسے ہی نفس سمجھ لے گا۔کیونکہ وہ اس نفس کو نہیں جانتا۔مثلاً ایک چھوٹا آئینہ ہاتھ میں لیا جائے۔وہ آئینہ بڑا ہو یا چھوٹا، اچھا ہو یا برا اس کا کام ہی چیزیں دکھاتا ہے۔یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔یہ بات ہر شخص سمجھ نہیں سکتا۔اس نے جواب دیا اسی قدر کافی ہے کہ اس آئینہ میں کانٹا، کانٹا ہی ظاہر ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ہم جو کچھ بھی دیکھتے ہیں۔اس کی ایک الگ دنیا ہے۔یہ دنیا الگ اس لیے ہے کہ ہم اسے طلب کریں۔انسان کے حصہ میں وہی خوشیاں آتی ہیں جو حیوانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔یہ تمام حیوانی قوت ہے۔جو آدمی کو آدمی بناتی ہے۔اور جو حقیقت ہے وہ انسان ہے اور انسان کم ہوتا جاتا ہے۔آخر میں فرمایا کہ انسان بولنے والا حیوان ہے۔الانسان حیوان ناطق۔پس آدمی دو چیزوں پر مشتمل ہوا۔اس دنیا میں جو حیوانی قوت اس میں ہے وہ شہوات اور آرزوئیں ہیں۔لیکن جو کچھ ان سب کا خلاصہ ہے اس کی غذا علم حکمت اور اللہ کا دیدار ہے۔آدمی میں جو حیوانیت ہے وہ حق سے گریزاں ہے اور اس کی انسانیت دنیا سے روگرداں ہے۔

فمنکم کافر و منکم مومن پس تم ہی میں کافر بھی ہیں اور تم ہی میں مومن بھی۔

اس وجود میں دو شخص برسرِ پیکار ہیں۔

صفات کی حقیقت و ماہیت کیا ہے

شیخ ابراہیم کہتا ہے کہ جب سیف الدین فرخ کسی شخص کو پیٹتا، تو اپنے آپ کو کسی دوسرے آدمی سے باتوں میں مشغول کر لیتا کہ وہ اسے مارے۔ اور اس معاملہ میں اور اس طریقہ میں کسی کی سفارش کارگر نہیں ہوتی۔ مولانا نے یہ سن کر فرمایا کہ تو اس دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے، دوسرے جہان میں ویسا ہی ہے۔ بلکہ یہ سب نمونے اس جہان کے ہیں۔ اور جو کچھ اس دنیا میں ہے، یہ سب کا سب وہیں سے آیا ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

کوئی شے ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔ لیکن ہم اس میں سے ایک مقرر مقدار کے مطابق اتارتے رہتے ہیں۔

طوّاق اپنے تھالوں میں مختلف دوائیں رکھتا ہے۔ ہر انبار میں سے مٹھی مٹھی بھر دوائیں ان تھالوں میں ہوتی ہیں۔ فلفل اور مصطگی کے انبار بے انتہا ہیں لیکن طواق کے تھالوں میں اس مقدار سے زیادہ دوائیں نہیں سما سکتیں۔ پس انسان کی مقدار طواق کی سی ہے یا عطار کی دکان جیسی۔ کیونکہ انسان میں خدا نے صفات کے خزانوں میں سے مٹھی مٹھی بھر اور ٹکڑا ٹکڑا صاف تھالوں میں اور ڈبوں میں رکھ دی ہیں تاکہ انسان دنیا میں اپنے لائق تجارت کرے۔ کچھ حصہ سماعت کا، کچھ حصہ بصارت کا، کچھ گویائی کا، کچھ عقل کا، کچھ احسان کا، کچھ علم کا دے دیا۔ پس انسان خدا کے طواق ہیں وہ طواقی کرتے ہیں، اور خدا رات دن تھالوں کو پر کرتا ہے۔ اور تو انھیں خالی کرتا رہتا ہے۔ یا ضائع کر دیتا ہے، تاکہ تو اس سے کسب کرے۔ تو دن کو انھیں خالی کرتا ہے اور رات کو وہ انھیں پھر پُر کر دیتا ہے اور خدا دیتا ہے۔ مثلاً تو آنکھ کی روشنی کو دیکھتا ہے۔ اس جہان میں آنکھیں ہی آنکھیں اور نظریں ہی نظریں ہیں۔ خدا نے ان میں سے تجھے مختلف نمونے دیئے۔ تاکہ تو ان سے دنیا کا سیر تماشا کرے۔ اس

جہان میں صرف اتنی ہی نظر نہیں۔ لیکن انسان اتنی نظر سے زیادہ برداشت نہیں کرتا۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سب صفات ہمارے پاس بے انتہا ہیں۔ ہم ان میں سے ایک معین مقدار میں صفات تیرے پاس بھیجتے ہیں۔ سوچ تو سہی کتنے کروڑ خلقت صدی بعد صدی آئی اور اس دریا سے پُر ہوئی۔ اور پھر خالی ہوگئی۔ دیکھ کہ وہ کتنا بڑا انبار ہے کہ جو شخص اس دریا پر جتنا زیادہ عرصہ ٹھہرے اتنا ہی اس کا دل تھال کی طرف سے بھر جاتا ہے۔ پس سمجھ لے کہ یہ ساری دنیا ایک ٹکسال میں سے برآمد ہوتی ہے اور پھر وہیں چلی جاتی ہے کہ:

بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

یعنی ہمارے تمام اجزاء اسی جگہ سے آئے ہیں۔ نمونے وہیں پر ہیں۔ اور چھوٹے بڑے اور حیوانات سب پھر اسی طرف لوٹتے ہیں۔ لیکن ان تھالوں کے وجود میں وہ جلدی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ان تھالوں کے وجود کے بغیر ان کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم ایک عالمِ لطیف ہے اور نظر نہیں آتا۔ لیکن اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ جب نسیم بہار آتی ہے تو اس کے ذریعے تو اشجار، سبزہ زار، باغات اور حسن بہار کے پھولوں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور ان کا تماشا کرتا ہے۔ اور جب تو نسیمِ بہار کی ذات کو دیکھتا ہے تو ان میں سے تجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں سیر و تماشا اور گل و گلزار نہیں۔ آخر یہ گل و گلزار اسی کا عکس تو ہیں۔ بلکہ گل و گلزار سے اس میں موجیں اٹھتی ہیں۔ لیکن یہ موجیں لطیف ہیں اور نظر نہیں آتیں، سوائے واسطے کے۔ لطافت ان موجوں کو نظر نہیں آنے دیتی۔ بالکل اسی طرح انسان میں اوصاف پوشیدہ ہیں۔ یہ اوصاف اندرونی یا بیرونی واسطے کے بغیر، جیسے کسی کی گفتگو، کسی کے آسیب، کسی کی صلح یا جنگ نظر نہیں آتے۔ جب تک درمیان میں ایک واسطہ نہ ہو، یہ ان صفات سے خالی سمجھتا ہے۔ اس کی وجہ نہیں کہ تو جو کچھ تھا، اس سے متغیر ہو گیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ صفات تجھ میں پوشیدہ ہیں۔ ان کی مثال دریا کے پانی کی سی ہے۔ پانی دریا سے باہر نہیں آتا۔ دریا سے باہر یہ بادل ہی

کے ذریعے آتا ہے۔اور سوائے لہروں کی صورت یہ نظر نہیں آتا۔لہر ایک جوش ہے جو بیرونی واسطہ کے بغیر تیرے اندر سے ظاہر ہوتا ہے۔لیکن دریا جب تک ساکن ہے تجھے کچھ نظر نہیں آتا۔تیرا جسم دریا کے کنارے ہے۔اور تیری جان ایک دریا ہے۔کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہزار مچھلیاں،سانپ اور دوسری رنگارنگ مخلوق دریا میں ہوتی ہے۔یہ مخلوق اپنے آپ کو دکھائی دیتی ہے،اور پھر دریا میں چلی جاتی ہے۔تیری صفات جیسے غصہ،حسد،شہوات وغیرہ راز کے اسی دریا سے آراستہ ہیں۔پس تیری صفات بھی عاشقانِ زار ہیں اور لطیف ہیں۔ انھیں دیکھا نہیں جاسکتا،سوائے اس کے کہ وہ زبان کے جامہ میں ہوں۔جب یہ صفات برہنہ ہوتی ہیں،نظر نہیں آتیں بلکہ ان کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

اسباب کی حیثیت دراصل ایک پردے کی ہے

مولانا رومؒ سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ التحیات کے کیا معنی ہیں؟اور الصلوٰۃ والطیبات کیا ہے؟ جواب میں فرمایا، یعنی یہ کہ پرستشیں، خدمتیں، بندگی اور مراعات مجھ سے نہیں بجالائی جاتیں۔ مجھے ان کے لیے فرصت نہیں۔ پس یہ حقیقت ٹھہری کہ طیبات اور تحیات سب خدا ہی کی ہیں۔ یہ میری نہیں، یہ اسی کی ملکیت ہیں۔

جیسا کہ بہار کے موسم میں لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں، صحرا میں نکل جاتے ہیں، سفر کرتے ہیں، اور مکان بناتے ہیں۔ یہ سب بہار کی بخشش اور عطا ہے۔ ورنہ یہ سب لوگ جیسا کہ تھے گھروں اور غاروں میں محبوس تھے۔ پس درحقیقت یہ کھیتی باڑی، یہ سیر و تماشا اور ناز و نعمت بہار ہی کی ملکیت ہے۔ اور وہی ولی نعمت ہے۔ انسان کی نظر اسباب پر ہوتی ہے۔ اور کاموں کو ان اسباب کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اولیاء پر یہ منکشف ہو چکا ہے کہ اسباب ایک پردے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ پردہ اسی لیے ہے کہ مسبب کو نہ دیکھیں اور نہ جانیں، یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص پردے کے پیچھے سے گفتگو کرے تو لوگ سمجھیں گے کہ پردہ بات کر رہا ہے۔ اور وہ یہ نہ سمجھیں گے کہ پردہ مصروف کار نہیں بلکہ وہ تو محض ایک حجاب ہے۔ گفتگو کرنے والا پردے سے باہر آ جائے تو سب جان لیں گے کہ پردہ ایک بہانہ تھا۔ خدا کے اولیاء نے بغیر اسباب کے کام ہوتے بھی دیکھے ہیں۔ اسباب سے بالکل آزاد تھے پھر بھی کام سرانجام پا گئے۔ جیسے پہاڑ میں سے اونٹنی نکل آئی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن گیا۔ اور سنگِ خارہ سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ اور جیسے حضرت سرور

کائناتؐ نے بغیر کسی اوزار سے اشارہ ہی سے چاند کو شق کر دیا۔ اور جیسے حضرت آدم علیہ السلام ماں اور باپ کے بغیر وجود میں آ گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ گل و گلزار بن گئی۔

اسی طرح کے کرشموں کی کوئی حد نہیں۔ پس جب انھیں دیکھا تو سمجھ گئے کہ اسباب محض بہانہ ہے کارساز کوئی دوسرا ہے۔ اسباب برائے روپوشی کے اور کچھ نہیں، تاکہ لوگ ان اسباب ہی میں مشغول رہیں۔ زکریا علیہ السلام سے خداوند تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں تجھے فرزند دوں گا۔ وہ پکار اٹھا کہ میں بوڑھا ہو چکا۔ میری بیوی بوڑھی ہو چکی۔ شہوانی آلہ کمزور ہو گیا ہے۔ بیوی اس حالت کو پہنچ چکی ہے کہ بچہ اور حمل ہو سکنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اے خدا! ایسی بڑھیا کو کیسے بچہ پیدا ہوگا؟

''اس نے عرض کیا، اے خدا! میرے گھر اولاد کیسے ہوگی؟ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔''

جواب آیا خبردار زکریا! تو نے پھر سررشتہ گم کر دیا۔ میں نے سو ہزار مرتبہ بغیر اسباب کے کام کر دکھائے ہیں، تو انھیں بھول گیا۔ تو نہیں جانتا کہ اسباب بہانہ ہوتے ہیں۔ میں اس بات پر قادر ہوں کہ اسی لمحہ تیرے دیکھتے ہی دیکھتے تجھ میں سے سو ہزار بیٹے پیدا کر دوں۔ بغیر عورت کے اور بغیر حمل کے۔ بلکہ اگر میں اشارہ کر دوں تو دنیا میں ایسی خلقت پیدا کر دوں جو پیدائش کے وقت ہی سے تمام کی تمام بالغ اور دانا ہو۔ کیا میں نے تجھے عالمِ ارواح میں بغیر ماں باپ کے ہست نہیں کیا۔ تیرے اس وجود میں آنے سے پہلے میں نے تجھ پر الطاف و عنایات کیں تو تُو انھیں کیسے فراموش کر سکتا ہے؟ انبیاء، اولیاء اور نیک و بد اخلاق کے احوال کو ان کے مراتب اور جوہر پر قیاس کرنا ہو تو اس کی مثال یہ ہے کہ کافرستان سے غلاموں کو مسلمانوں کے ملک میں لاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو آئے پانچ سال ہو جاتے ہیں۔ بعض کو دس سال اور بعض کو پندرہ سال بیت جاتے ہیں۔

وہ غلام جو بچپن میں لائے جائیں اور مسلمانوں کے درمیان رہ کر کئی سال پرورش پائیں اور بوڑھے ہو جائیں، وہ اپنے ملک کے حالات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ وہاں کی کوئی نشانی انھیں یاد نہیں رہتی۔ اور جو ذرا بڑے ہوتے ہیں، انھیں کچھ کچھ یاد رہتا ہے۔ اور جو زیادہ مضبوط اور بڑے ہوتے ہیں، انھیں بڑا کچھ یاد رہتا ہے۔

بالکل یہی حال حضور باری تعالیٰ میں ارواح کا تھا کہ:

الست بربکم قالوا بلیٰ. (اعراف:۲۲) کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟
(ارواح نے) عرض کیا کہ ضرور ہیں!

ان ارواح کی غذا اور خوراک خدا کا کلام تھا، جو بغیر حرف کے اور بغیر آواز کے تھا۔ جب ان ارواح میں سے بعض کو عالم طفلی ہی میں اس دنیا میں لے آئے۔ اور مدت کے بعد انھوں نے یہاں وہ کلام سنا تو وہ احوال انھیں یاد آئے۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو اس کلام سے بیگانہ پایا۔ یہ فریق بہت محجوب ہے کہ کفر اور گمراہی کے گڑھے میں مکمل طور پر گر گیا۔ بعض کو وہ کلام تھوڑا سا یاد آتا ہے۔ وہاں کا جوش اور وہاں کی خواہش ان میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ مومن ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو اس کلام کو سنتے ہیں، تو ان کی نظر میں وہی حالت پیدا ہو جاتی ہے، جو اس قدیم وقت میں تھی۔ ان کے سامنے سے حجاب اٹھ جاتے ہیں۔ اور انھیں وہی وصل میسر آ جاتا ہے اور یہ لوگ انبیاء اور اولیاء ہیں۔

عقل کی قوت اور تاثیر

نائب نے کہا، اس سے قبل کافر بُت کو پوجتے اور سجدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس زمانہ میں ہم یہی کرتے ہیں۔ یہ کیا کہ ہم جاتے ہیں اور مغلوں کے سامنے سجدہ تعظیم کرتے ہیں اور ہم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور ایسے ہی حرص و ہوا، کینہ، حسد کے کئی بت ہم اپنے باطن میں بھی رکھتے ہیں۔ ہم ان سب کے تابع ہیں۔ پس ظاہر اور باطن میں ہم وہی کام کرتے ہیں، پھر اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں۔

فرمایا، مگر یہاں دوسری بات ہے۔ جب تمھاری طبیعت میں یہ آتا ہے کہ یہ بد اور ناپسندیدہ ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھارے دل کی آنکھ نے اس بے مثال اور عظیم چیز کو دیکھا ہے۔ یہی اسے زشت اور قبیح دکھاتی ہے۔ کھاری پانی اس شخص کو کھاری معلوم ہوتا ہے، جس نے شیریں پانی پیا ہو:

وبضدھا تتبیّن الاشیاء. ضد سے چیزوں کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔

پس خداوند تعالیٰ نے تمھاری روح میں ایمان کا نور رکھ دیا ہے۔ یہی کاموں کو زشت دکھاتا ہے، خوب کے مقابلے میں زشت کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ دوسرے لوگوں میں یہ درد موجود نہیں، وہ جس حال میں ہیں خوش ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خود خداوند تعالیٰ کا یہ کام ہے کہ وہ تمھیں وہ کچھ دے جو تمھیں مطلوب ہے اور تمھاری ہمت تمھیں جتنی دور لے جا سکے، وہیں تک جاؤ گے:

الطیر یطیر بجناحیه والمؤمن یطیر بهمته. پرندہ اپنے بازوؤں سے اڑتا ہے اور مومن اپنی ہمت سے۔

خلقت کی تین اصناف ہیں۔ بعض ملائکہ ہیں کہ یہ عقل محض ہے۔ ان کی فطرت میں عبادت، بندگی اور ذکر ہے۔ یہی ان کی خوراک ہے اور اسی سے وہ زندہ ہیں۔ ان کی مثال پانی کی مچھلی کی سی ہے کہ اس کی زندگی پانی ہی سے ہے۔ اس کا اوڑھنا بچھونا پانی ہے۔ پانی اس کے لیے تکلیف کا باعث نہیں۔ یہ صنفشہوت سے معرا ہے، پاک ہے۔ اگر اسے شہوت نہیں آتی۔ اور نفسیاتی خواہش نہیں ہوتی، تو چونکہ وہ اس سے پاک ہے۔ یہ اس کی کوئی نیکی نہیں۔ اسے کوئی مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ اور اگر وہ بندگی بجالاتا ہے تو اسے شمار میں نہیں لایا جاتا، کیونکہ اس کی فطرت یہی ہے۔ وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ دوسری صنف جانور ہے کہ ان میں محض شہوت ہے، عقل انھیں نہیں روکتی۔ انھیں اس مسکین آدمی کی طرح تکلیف نہیں پہنچتی جو عقل اور شہوت سے مرکب ہے، جس کا نصف فرشتہ ہے اور نصف حیوان۔ نصف سانپ اور نصف مچھلی، جیسے مچھلی پانی کی طرف کھینچتی ہے اور سانپ خاک کی طرف، جو کش مکش میں ہے اور جنگ کر رہا ہے۔

من غلب عقلا شهوته فهو اعلیٰ من الملائکة و من غلب شهوتهٗ عقلا فهو ادنیٰ من البهائم. جس نے اپنی عقل کو شہوت پر غالب کیا، وہ فرشتوں سے بھی برتر ہوا۔ اور جس نے اپنی شہوت کو عقل پر غالب کیا، وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوا۔

اب بعض آدمیوں نے عقل کی اتنی متابعت کی کہ وہ کلی طور پر فرشتہ بن گئے اور نورِ محض ہو گئے۔ یہ اولیاء اور انبیاء ہیں، یہ خوف ورِجا سے آزاد ہوئے۔

لاخوف علیهم ولاهم یحزنون. نہ انھیں خوف ہے اور نہ وہ محزون ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ کلی طور پر عقل کا حکم ماننے لگے۔ بعض کی عقل پر یہ شہوت غالب آ گئی

اور بعض عقل اور شہوت کے نزاع میں رہے۔ یہ وہ گروہ ہیں جس کے اندر رنج، درد، آہ وفغاں اور حسرت کا مادہ پیدا ہو چکا ہے۔ اور یہ لوگ اپنی زندگی سے راضی نہیں ہیں۔ یہ مومن ہیں۔ اولیاء ان کے منتظر ہیں کہ وہ ان مومنوں کو اپنی اولیائی کی منزل پر پہنچائیں اور اپنے جیسا بنالیں۔ ادھر شیاطین بھی ان کے منتظر ہیں کہ انھیں اسفل السافلین بنالیں۔ شیاطین انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

جیسا کہ مولانا کے ایک شعر کا مفہوم ہے:

ہم چاہتے ہیں اور دوسرے بھی چاہتے ہیں۔ دیکھئے قسمت کس کا ساتھ دیتی ہے اور نصیب کس کی مدد کرتا ہے۔

مولانا رومؒ کے نزدیک دوستی کے دو رُوپ

مولانا روم کہتے ہیں کہ ہم امیر کو دنیا اور اس کے مرتبہ، علم اور اس کے عمل کی وجہ سے دوست نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ اس کو ان وجوہ کی بناء پر دوست رکھتے ہیں، کیونکہ وہ امیر کا منہ نہیں دیکھتے، امیر کی پیٹھ کو دیکھتے ہیں۔ امیر آئینے کی طرح ہے، اور یہ صفات قیمتی موتیوں کی طرح اور سونے کی طرح ہیں، جو آئینے کی پشت پر لگا ہوا ہے۔ وہ لوگ جو سونے کے عاشق ہیں، ان کی نظر آئینے کی پشت پر ہے اور جو آئینے کے عاشق ہیں، ان کی نظر موتیوں اور سونے پر نہیں۔ وہ اپنی نظر آئینے پر جمائے ہوئے ہیں۔ اور آئینے کو محض اس کے آئینے ہونے کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ آئینے میں اپنا حسن دیکھتے ہیں۔ آئینے سے وہ ملول نہیں ہوتے۔ لیکن وہ جن کا چہرہ بدصورت اور عیب دار ہے، وہ آئینے میں زشتی دیکھتا ہے۔ وہ جلدی سے آئینے کو پھیر دیتا ہے۔ اور ان جواہرات کا طالب ہوتا ہے۔ اب آئینے کی پشت پر ہزار رنگ کے نقوش بناتے ہیں۔ اور جواہرات ٹکاتے ہیں۔ اس سے آئینے کے چہرے کا کیا بگڑتا ہے؟ اب خداوند تعالیٰ نے حیوانیت اور انسانیت کو مرکب کیا ہے تاکہ دونوں ظاہر ہوں اس لیے کہ:

وبضد ها لتبین الا شیاء. ضد سے اشیاء میں فرق کیا جاتا ہے۔

کسی چیز کی تعریف اس کی ضد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور خداوند تعالیٰ کی ضد نہیں، فرماتا ہے:

کنت کنزاً مخفیاًفاَجبت بان اعرف. میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے واجب سمجھا کہ پہچانا جاؤں۔

پس یہ عالم پیدا کیا جو ظلمت ہے، تاکہ اس کا نور ظاہر ہو۔ اس طرح اس نے اولیاء کو

پیدا کیا ہے کہ:

اخرج بصفاتی الیٰ خلقی۔ میری صفات کو لے کر میری مخلوق کی طرف آؤ۔

اور یہ خدا کے نور کے مظہر ہیں، تاکہ دشمن سے دوست جدا کیا جائے۔ اور بیگانہ سے یگانہ ممتاز کیا جائے۔ معنی کے لحاظ سے اس کی کیفیت کی کوئی ضد نہیں ہے۔ سوائے ظاہری صورت کے، جس طرح کے آدم کے مقابلے میں ابلیس، موسیٰؑ کے مقابلے میں فرعون، ابراہیم کے مقابلے میں نمرود اور حضور سرورِ کائنات ﷺ کے مقابلے میں ابوجہل۔ پس اولیاء سے خدا کی ضد پیدا ہوتی ہے، اگرچہ معنی میں وہ ضد نہیں رکھتا۔ اس سے جتنی دشمنی اور ضد دکھاتے ہیں، اتنا ہی وہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور زیادہ مشہور ہوتے ہیں:

یریدون لیطفؤ انور اللہ با فواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون. (الصف: ع ۱) وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کر کے ہی رہے گا۔ اگرچہ یہ بات اہل کفر کو ناگوار ہی ہو۔

مولانا کے دو اشعار کا مفہوم ہے:

''چاند نور چھڑکتا ہے، اور کتا بھونکتا ہے۔ اس میں چاند کا کیا قصور؟ کتا ہے ہی ایسا۔''

''چاند سے آسمان کے ارکان نور لیتے ہیں۔ وہ کتا کیا حیثیت رکھتا ہے کہ زمین کا کانٹا بھی بن جائے۔''

بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انھیں خداوند تعالیٰ نعمت، مال، زر اور امارت سے عذاب دیتا ہے۔ اور ان کی جان ان سے گریز نہیں کرتی۔

ایک فقیر نے ملکِ عرب میں ایک امیر کو سوار دیکھا۔ اس کی پریشانی میں انبیاء و اولیاء کی روشنی دیکھی۔ کہا سبحان اللہ!

یعذّب عبادہٖ بالنعم. پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندوں کو نعمتوں سے عذاب دیتا ہے۔

عورت اپنی فطرت کے آئینے میں

مولانا فرماتے ہیں کہ تو رات دن جنگ کرتا ہے اور عورت کی تہذیب وشائستگی کا طالب ہے۔ اور عورت کی نجاست کو اپنے آپ سے صاف کرتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے پاک کرتا ہے۔ بہتر ہے تو اسے اپنے آپ میں پاک کرے۔ اپنے آپ کو اس سے مہذب بنا۔ اس کی طرف جا، اور جو وہ کہے اسے تسلیم کر۔ خواہ تیرے نزدیک اس کی بات محال ہی کیوں نہ ہو۔ اور غیریت کو چھوڑ دے۔ اگرچہ غیریت مردوں کا وصف ہے لیکن اس اچھے وصف ہی سے تجھ میں بڑے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ اسی کی خاطر حضرت رسالتمآب ﷺ نے فرمایا:

لا رھبانية في الاسلام.　　　　اسلام میں ترکِ دنیا نہیں۔

دنیا کے تارک خلوت کے راستہ پر چلتے ہیں۔ پہاڑوں میں بیٹھنا، عورت کو اچھا نہ سمجھنا اور ترکِ دنیا ان کا طریق ہے۔ ربّ عزوجل نے پیغمبر ﷺ کو ایک چھپا ہوا باریک راستہ دکھا دیا۔ اور وہ راستہ کیا ہے؟ عورت کو چاہنا تاکہ عورتوں کے ظلم سہے اور ان کی محال باتیں سنے۔ خجالت ہو، اور اپنے آپ کو مہذب بنائے۔

وانک لعلیٰ خلق عظیم.　　　　آپ بہترین اخلاق پر قائم ہیں۔

دوسروں کے ظلم سہنا اور تحمل کرنا ایسا ہی ہے کہ تو اپنی غلاظت کو ان سے مل دیتا ہے۔ تیرا اخلاق بردباری سے اچھا ہو جاتا ہے۔ اور خجالت اور تعدّی سے ان کا اخلاق بد ہو جاتا ہے۔ پس جب تو نے یہ بات سمجھ لی، تو اپنے آپ کو پاک کر لیا۔ انھیں لباس کی طرح سمجھ۔ کیونکہ

اپنی پلیدی کو تو ان سے پاک کرتا ہے اور تو پاک ہو جاتا ہے۔ اگر تجھ سے خود ایسا نہ ہو تو عقل کی رُو سے اپنے آپ کو سمجھا کہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ نکاح نہیں ہوا۔ یہ ایک آوارہ معشوقہ ہے۔ جب بھی شہوت غالب آتی ہے، میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ اس طریق پر اپنے آپ سے حمیت، حسد اور غیرت کو دور کر، تا کہ اس سے ورے تجھے مجاہدہ اور تحمل کا مزہ آنے لگے اور ان کے محالات سے تیرا حال ظاہر ہو تو اس کے بعد اپنے آپ پر زور دیئے بغیر ہی تو مزید تحمل اور مجاہدہ کو برداشت کر سکے۔ کیونکہ تو اس میں ایک معین فائدہ دیکھے گا۔

کہتے ہیں، کہ حضرت نبی کریمؐ اپنے صحابہ کے ہمراہ جنگ سے لوٹ رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، آج رات ڈھول بجایا جائے اور شہر کے دروازہ پر سوئیں۔ کل شہر کے اندر جائیں۔ صحابہ نے پوچھا، یارسول اللہ ﷺ اس میں کیا مصلحت ہے؟ فرمایا کہ (یکا یک چلے جانے سے) ہوسکتا ہے تم وہاں اپنی عورت کو بیگانہ مردوں کے ساتھ دیکھو۔ اور تمھیں دُکھ پہنچے اور فتنہ پیدا ہو جائے۔ صحابہ میں سے ایک نے یہ بات نہ سنی۔ وہ (اپنے گھر) چلا گیا۔ اپنی بیوی کو غیر مرد کے ساتھ پایا۔

سرکار رسالتمآبؐ کا طریق یہ ہے کہ غیرت اور حمیت کو دور کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ اور عورت کو روزی اور کپڑا مہیا کرنے کے لیے مشقت کرنی چاہیے۔ سو ہزار بڑے غم چکھو تو عالمِ محمدیؐ اپنا چہرہ دکھائے۔ حضرت عیسٰیؑ کا طریق، خلوت کا مجاہدہ اور شہوت کو روکنا ہے۔ جبکہ جنابِ رسول کریمؐ کا راستہ عورت اور مرد کے ظلم اور غصہ کو برداشت کرنا ہے۔ اگر تو محمدیؐ راستہ پر نہیں چل سکتا تو عیسٰیؑ کے راستہ پر چل تا کہ تو بالکل ہی محروم نہ رہے۔ بشرطیکہ تو یہ وصف رکھتا ہو کہ سو چپت کھالے اور پھر اسی کو اس کا حاصل سمجھے۔ یا تو غیب کا معتقد ہو جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے اور خبر دی ہے۔ اور سمجھ لے کہ کوئی ایسی چیز ہے۔ اس وقت تک صبر کروں کہ وہ حاصل جس کی انھوں نے خبر دی ہے، مجھ تک بھی پہنچ جائے۔ اس کے بعد تو دیکھے گا کہ اگرچہ تیرے دل میں یہ بات ہوگی کہ ان تکلیفوں کا حاصل

اس گھڑی میرے لیے کچھ نہیں، آخر کار جو خزانے میں چاہتا ہوں، ان تک میں پہنچ جاؤں گا۔ اور جن خزانوں کی تجھے طمع تھی اور جن کی تجھے امید تھی، ان سے بھی بڑھ کر وہ خزانے ہوں گے، جن تک تیری رسائی ہوگی۔ اگرچہ یہ بات اس وقت تجھ پر اثر نہیں کرتی تو جیسا تو پختہ ہو جائے، اس وقت یہ بہت زیادہ اثر کرے گی۔ عورت کیا ہوتی ہے؟ دنیا کیا ہوتی ہے؟ تو خواہ کہہ، خواہ نہ کہہ، وہ وہی کچھ ہے جو کچھ کہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتی ہے اس سے وہ باز نہ آئے گی۔ بلکہ تیرے کہنے سے وہ بد سے بدتر ہی ہوگی۔

مثال کے طور پر روٹی کھالے اور اسے بغل میں دبالے، اور کسی کو نہ دے اور کہہ دے میں کسی کو نہ دوں گا۔ دینا تو ایک طرف میں دکھاؤں گا بھی نہیں۔ اگرچہ روٹیاں کثرت اور ارزانی کی وجہ سے دروازوں کے سامنے ڈھیروں کی صورت میں پڑی ہوں۔ اور انھیں کتے بھی نہ کھاتے ہوں۔ مگر تو نے اس روٹی سے خلقت کو منع کیا ہے، وہ اس طرف راغب ہو جاتی ہے اور اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور ہر اچھے برے طریقے سے چاہتی ہے کہ اسے دیکھ کر چھوڑے، جس سے تو نے اسے منع کیا ہے اور جسے تو نے چھپایا ہے۔ خاص کر اگر تو اس روٹی کو سال بھر چھپائے پھرے اور مبالغہ کے ساتھ تاکید کرتا رہے کہ تو اسے کسی کو نہ دکھائے گا تو خلقت کی رغبت حد سے زیادہ گزر جائے گی۔ کیونکہ طبعاً انسان اس چیز کا حریص ہے جس سے اسے منع کیا جائے۔ تو عورت کو جتنا زیادہ حکم دے کہ چھپی رہے اتنا ہی اسے اپنے آپ کو دکھانے کی فکر ہوگی۔ اور عورت کے چھپنے سے خلقت کو اس کی طرف اور زیادہ رغبت ہو جاتی ہے۔ پس تو بیٹھا ہوا ہے اور دو طرف سے رغبت کو بڑھا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ تو اصلاح کر رہا ہے۔ یہ خود عین فساد ہے۔ اگر اس عورت میں یہ خوبی ہے کہ وہ فعلِ بد نہ کرے تُو خواہ منع کرے اور خواہ نہ کرے، وہ اپنی نیک طبع اور پاک سرشت پر چلے گی۔ پس تو فارغ ہو جا اور تشویش نہ کر۔ اور اگر عورت کی طبع اور سرشت اس کے برعکس ہو تو پھر بھی وہ اپنے ہی طریق پر چلے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا منع کرنا، سوائے رغبت بڑھانے کے اور کچھ نہ کرے گا۔

کیا اس کائنات کا قیام خیال پر منحصر ہے؟

مولانا روم فرماتے ہیں کہ دوست اچھی چیز ہے۔ اس لیے کہ ایک دوست دوسرے دوست کے خیال سے قوت حاصل کرتا ہے اور فروغ پاتا ہے۔ اور زندگی حاصل کرتا ہے۔ اس میں کون سی تعجب کی بات ہے کہ مجنوں کو لیلیٰ کے خیال نے قوت دی۔ اور وہ اس کی غذا بن گیا۔ جہاں مجازی معشوق کے خیال میں اتنی قوت اور تاثیر ہوتی ہے وہاں دوستِ حقیقی پر تجھے کیوں اتنا تعجب آتا ہے کہ اُس کا خیال حضوری اور غیبت میں قوت بخشتا ہے۔ یہ کیا سوچنے کی بات ہے۔ وہ خود تمام حقیقتوں کی جان ہے۔ اس کو خیال نہیں کہتے۔ دنیا خیال پر قائم ہے۔ اور تو اس دنیا کو اس لیے حقیقت کہتا ہے کہ وہ نظر آتی ہے اور محسوس ہوتی ہے۔ اور اس معنی کو جس کی ایک شاخ یہ دنیا ہے تو خیال کہتا ہے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خیال خود یہ دنیا ہے۔ کیونکہ اس معنی سے بے شمار ایسے جہان پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر خراب ہو جاتے ہیں اور ویران ہو جاتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ ایک بہتر عالمِ نور پیدا کر لیتا ہے۔ جو پھر پرانا نہیں ہوتا۔ وہ نئے پن اور قدامت سے منزہ ہوتا ہے۔ اس کی شاخیں نئے پن اور قدامت سے متصف ہوتی ہیں۔ اور وہ کہ ان کا حادث ہے، ان دونوں سے منزہ ہے۔ اور ہر دوست سے ورے ہے۔ ایک مہندس نے دل میں ایک خاکہ بنایا اور خیال باندھا کہ اس کا عرض اتنا ہے، طول اتنا ہے، اور اس کا چبوترہ اتنا ہے اور صحن اتنا ہے۔ اسے خیال نہیں کہتے۔ کیونکہ وہ حقیقت اس خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس خیال کی شاخ ہے۔ ہاں اگر کوئی غیر مہندس ایسی صورت دل میں خیال کرے۔ اور تصور کرے۔ تو اسے خیال کہتے ہیں۔ اور عرفِ عام میں لوگ ایسے آدمی کو کہہ دیتے ہیں۔ یہ تیرا خیال ہے جو معمار نہ ہو۔ اور اس کا علم نہ رکھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بخشش و عطا درحقیقت اس کی تقدیر ہے

مولانا کہتے ہیں کہ ان شاء اللہ ہم امیدوار ہیں کہ خداوند تعالیٰ امیر کو مقصود حاصل کرائے گا۔ جو کچھ اس کے دل میں ہے اور وہ دولت بھی جس کا اس کے دل میں خیال نہیں، اور جس کے متعلق وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے تاکید اسے چاہیے۔ امید ہے کہ یہ سب اسے میسر آئے گا جب وہ انھیں دیکھے گا اور وہ انعامات اسے ملیں گے، تو اسے اپنی پہلی خواہشات اور تمناؤں پر شرم آئے گی کہ ایسی چیزیں میرے سامنے موجود تھیں۔ ایسی دو حالتیں اور نعمتیں! تعجب ہے میں نے ان گھٹیا چیزوں کی تمنا کی۔ مجھے شرم آتی ہے۔ اب عطا اسے کہتے ہیں، جو آدمی کے وہم میں نہیں آتی۔ اس لیے جو کچھ اس کے خیال میں گزرتا ہے، وہ اس کی ہمت کا اندازہ اور اس کی قدر کا تخمینہ ہوتا ہے، لیکن خدا کی عطا خدا کا اندازہ ہوتی ہے۔

پس عطا وہ ہوتی ہے جو خدا کے لائق ہو، نہ کہ بندے کے وہم اور ہمت کے قابل۔

ما لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علیٰ قلب بشر. جسے نہ آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور جو نہ کسی بشر کے دل پر منعکس ہوا۔

ہر چند کہ میری عطا سے تو نے جو توقع کی، آنکھوں نے انھیں دیکھا ہوا تھا اور کانوں نے اس جنس کو سنا تھا۔ دلوں میں وہ جنس منقش تھی۔ لیکن میری عطاء ان سب کے احاطہ سے باہر ہوتی ہے۔

اسی طرح مولانا کے افکار کے مطابق روحانی طلب کے بغیر اس کی رسد میسر نہیں آتی۔ جیسے بازار میں جو کوئی بھی دکان ہے یا کوئی پہننے کی چیز ہے یا پھر کسی قسم کا کوئی سامان ہے یا کوئی

ہنر ہے یا پھر سر رشتہ، ان میں سے ہر ایک کے لیے انسان کے نفس میں حاجت اور ضرورت ہے اور وہ سر رشتہ پوشیدہ ہے جب تک ان میں سے کسی چیز کی طلب نہ کی جائے وہ سر رشتہ حرکت میں نہیں آتا اور نہ ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حال ہر ملت، ہر دین، ہر کرامت، ہر معجزے، اور انبیاء کرام کے احوالِ مبارکہ کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا سر رشتہ روحِ انسانی میں پایا جاتا ہے اور جب تلک ان کی احتیاج نہ ہو، ضرورت اور طلب پیدا نہ ہو تو وہ سر رشتہ نہ تو حرکت میں آتا ہے اور نہ ہی ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے:

''ہر چیز ہم نے ایک کھلی ہوئی کتاب میں محفوظ کر دی ہے۔

کائناتِ انسانی میں ”عشق“ بھی ایک ناگزیر ضرورت ہے

مولانا روم کا ارشاد گرامی ہے کہ صورت عشق کی فرع بن گئی۔ کیونکہ عشق کے بغیر اس صورت کی قدر نہ تھی۔ فرع وہ ہوتی ہے جو اصل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پس اللہ تعالیٰ کو صورت نہیں کہتے۔ جب صورت فرع ہوئی تو اللہ تعالیٰ کو فرع نہیں کہہ سکتے۔ کہا کہ عشق بھی صورت کے بغیر متصود نہیں ہے۔ صورت کے بغیر عشق کا انعقاد نہیں۔ پس فرع صورت ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں، صورت کے بغیر عشق متصور کیوں نہیں؟ عشق تو صورت انگیز ہے۔ عشق سے سو ہزار صورت انگیختہ ہوتی ہے۔ ممثل بھی اور محقق بھی۔ اگرچہ نقش بغیر نقاش کے نہیں اور نقاش بغیر نقش کے نہیں ہوتا۔ لیکن نقش فرع ہے۔ اور نقاش اصل:

جس طرح انگلی کے ہلانے سے انگوٹھی ہلتی ہے۔

جب تک عشق خانہ نہ ہو، کوئی انجینئر خانہ کی صورت کا تصور نہیں کرتا۔ یہ اسی طرح ہے کہ ایک سال گندم سونے کے بھاؤ ہے اور ایک سال مٹی کے بھاؤ۔ گندم کی صورت وہی ہے، پس صورت گندم کی قدر و قیمت عشق ہوئی۔ اور اسی طرح سے وہ ہنر کہ جس کا تو طالب و عاشق ہوا ہوگا۔ تیرے نزدیک قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور اس دور میں جب کہ ہنر کی مانگ نہ ہو کوئی اس ہنر کو نہیں سیکھتا۔ اور اسے عمل میں نہیں لاتا۔ کہتے ہیں کہ عشق آخر کسی چیز کا افلاس ہے، اور احتیاج ہے۔ پس احتیاج اصل ہوتی ہے۔ اور احتیاج الیہ اس کی فرع۔ میں

نے کہا کہ تو جو یہ بات کہتا ہے، حاجت ہی سے کہتا ہے۔ آخر یہ بات تیری حاجت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تجھے اس بات کا میلان ہوا تو بات پیدا ہوگئی۔ پس احتیاج مقدم ہو گی۔ اور یہ بات اس سے پیدا شدہ ہے۔ گویا اس کے بغیر احتیاج کا وجود تھا۔ پس عشق اور احتیاج اس کی فرع نہ ہوئے۔ کہا آخر اس احتیاج کا مقصد یہ بات تھی۔ پس مقصود کے لیے فرع ہوا۔ میں نے کہا فرع ہمیشہ مقصود ہوتی ہے۔ کیونکہ مقصود درخت کے بیج سے ہے اور فرع درخت ہے۔

فقر و غنا ہی مقصودِ حقیقی ہے

مولانا بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ یہ قاضی ابو منصور ہروی کا قول ہے۔ کہا، قاضی منصور پوشیدہ کہتا ہے اور لپیٹ کر کہتا ہے اور بات واضح نہیں ہوتی لیکن منصور برداشت نہ کر سکا، اس نے کھل کر اور ظاہر ہو کر کہا کہ سارا عالم قضا کا اسیر ہے اور قضا اسیرِ شاہد ہے۔ شاہد پیدا کرتا ہے اور وہ چھپاتا نہیں۔

کہا قاضی کے سخن میں سے ایک صفحہ پڑھ۔ اس نے پوچھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو کسی عورت کو چادر اوڑھے دیکھتے ہیں تو حکم دیتے ہیں کہ نقاب اتار تا کہ ہم تیرا چہرہ دیکھیں کہ تو کون شخص اور کیا بات ہے۔ کیونکہ جب تو چھپ کر گزرتی ہے اور تجھے ہم نہیں دیکھتے، تو ہمیں تشویش ہوتی ہے کہ یہ کیا تھا، اور کون شخص تھا۔ ہم وہ نہیں ہیں کہ تیرا چہرہ دیکھ لیں تو تجھ پر عاشق ہو جائیں اور تجھ سے وابستہ ہو جائیں۔ ہماری عبادت گاہ خدا ہے جس نے ہمیں تجھ سے پاک اور فارغ کیا ہوا ہے۔ اس سے ہم محفوظ ہیں کہ اگر تجھے دیکھ لیں تو ہمیں تشویش اور عشق ہو جائے۔ البتہ نہ دیکھیں تو تشویش ہو گی کہ کون شخص تھا۔ اس کے برعکس اہلِ نفس کا گروہ ہے۔ اگر یہ لوگ حسینوں کا چہرہ دیکھ لیں تو عاشق ہو جاتے ہیں اور تشویش میں پڑ جاتے ہیں۔ پس ان کے حق میں یہ بہتر ہے کہ ان کے سامنے چہرہ نہ کھولو تا کہ انھیں عشق نہ ہونے پائے اور اہلِ دل کے حق میں یہ بہتر ہے کہ چہرہ کو کھول دیں، تا کہ فتنہ سے رہائی پائیں۔ ایک شخص نے کہا خوارزم میں کوئی عاشق نہیں ہوتا، اس لیے کہ خوارزم میں حسین بہت ہیں۔ جب وہ ایک حسین کو دیکھتے ہیں اور اس سے دل لگاتے

ہیں تو اس کے بعد اس سے بہتر حسین دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے پہلا حسین دل سے اتر جاتا ہے۔ فرمایا اگر خوارزم کے حسینوں پر کوئی عاشق نہیں ہوتا تو خوارزم پر عاشق ہونا چاہیے کیونکہ اس میں حسین بے حد ہیں۔ تو خواہ کسی کے سامنے بھی جھکے اور اس سے سکون پائے، ایک دوسرا حسین سامنے آ جاتا ہے، جس سے تو پہلے کو فراموش کر دیتا ہے۔ پس ہم فقر و غنا کے نفس پر عاشق و طلب گار ہوئے کیونکہ اس میں ایسے حسین ہیں۔

بلند منصب ایک طرح سے تختۂ دار کے مترادف ہے

مولانا کا قول ہے کہ بادشاہ کسی کو پھانسی پر چڑھاتا ہے تو اسے خلقت کے سامنے بہت اونچی جگہ پر لٹکا دیتے ہیں۔ اسے گھر میں پھانسی دی جاسکتی ہے اور حقیری میخ سے اسے لٹکایا جاسکتا ہے لیکن چاہتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں اور ان کے دلوں میں اعتماد پیدا ہو اور بادشاہ کے حکم کا نفاذ اور حکم کی تعمیل کا لوگوں کو علم ہو۔ آخر ہر پھانسی لکڑی کی نہیں ہوتی۔ منصب، بلندی اور دنیا کی دولت بھی تو بہت اونچی پھانسیاں ہیں۔ خداوند تعالیٰ جب چاہتا ہے کہ کسی کو پکڑے تو اسے بہت بڑا منصب اور بڑی بادشاہی دے دیتا ہے، جیسے فرعون اور نمرود وغیرہ کے ساتھ کیا۔ ان کے لیے وہ سب ایک پھانسی ہیں۔ خداوند تعالیٰ انھیں اس پھانسی پر چڑھا دیتا ہے تاکہ خلقت اس سے مطلع ہو۔ اسی لیے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف (حدیث قدسی) میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں۔ یعنی میں نے سارے جہان کو پیدا کیا اور اس سے میری غرض اپنے آپ کو ظاہر کرنا تھا۔ کبھی لطف سے اور کبھی قہر سے۔ یہ ایسا بادشاہ نہیں ہے جس کے ملک کو پہچاننے والا ایک ہی شخص کافی ہو۔ اگر دنیا کے ذرات تمام کے تمام اسے پہچاننے والے بن جائیں تو بھی وہ اس کی تعریف میں قاصر اور عاجز رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر زہر کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے

مولانا روم فرماتے ہیں کہ شکر بجالانا گویا نعمتوں کو شکار کر لینا اور انھیں اپنے قبضے میں کر لینا ہے۔ جب شکر کی آواز سنائی دیتی ہے تو مزید نعمت کی تیاری ہونے لگتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب جانتا ہے تو وہ اسے ابتلا میں ڈال دیتا ہے۔ اور اگر وہ بندہ صبر کرے تو اسے برگزیدہ بنالیتا ہے اور اگر وہ شکر کرے تو اسے چن لیتا ہے۔ بعض لوگ اللہ کا شکر اس کے قہر کی وجہ سے کرتے ہیں اور بعض اس کے لطف اور مہربانی کی بنا پر اس کا شکر بجالاتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ ہی اچھے ہیں کیونکہ شکر ایک ایسا تریاق ہے جو قہر کو لطف سے بدل دیتا ہے۔ کامل عاقل وہی ہوتا ہے جو جفا پر بھی حضور اس کے میں شکر بجالاتا ہے۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ برگزیدہ کر لیتا ہے۔ اگر اس کی مراد حصول دوزخ ہو تو شکوہ کے ساتھ اس کا مقصود جلدی حاصل ہوگا کیونکہ ظاہری شکوہ سے باطنی شکوہ کی تنقیص ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ضحوک وقتول ہوں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گنہگار کے سامنے میرا ہنسنا اس کا قتل ہے اور ہنسنے سے مراد شکوہ کی بجائے شکر کرنا ہے۔ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی رسول ﷺ کے اصحاب میں سے ایک کا ہمسایہ تھا۔ یہودی اوپر کی منزل میں رہتا تھا اور صحابی مکان کے نچلے حصے میں تھا۔ یہودی اوپر سے ناپاک پانی اور بچوں کا پیشاب اور پاخانہ اور کپڑوں کی دھلائی کا پانی نیچے پھینکتا تھا۔ صحابی خود اس یہودی کا شکریہ ادا کرتا اور اپنے اہل وعیال کو بھی شکریہ ادا کرنے کا حکم دیتا۔ اس حالت میں آٹھ برس گزر گئے۔ یہاں تک کہ صحابی وفات پا گیا اور یہودی اس کی تعزیت کے لیے اس کے گھر گیا۔

اب اس نے بالا خانہ کی موری میں سے وہ نجاستیں خارج ہوتی دیکھیں، تو اسے معلوم ہوا کہ گذشتہ زمانہ میں کیا ہوتا رہا ہے۔ وہ مزید شرمندہ ہوا اور صحابی کی بیوی سے کہا بہت افسوس ہے تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی۔ بلکہ تم ہمیشہ میرا شکریہ ادا کرتے رہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہمارے پروردگار کا ہمیں حکم تھا کہ ہم شکریہ ادا کرتے رہیں اور اس عمل کو ترک ہرگز نہ کریں۔ اس حسن عمل سے اس یہودی کے دل پر گہرا اثر ہوا اور وہ ایمان لا کر مسلمان ہو گیا۔ شکر اور شکریے کی حقیقت مولانا نے اپنے شعروں میں بیان فرمائی ہے آپ کے ایک شعر کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے:

نیکوں کا ذکر نیکی پر ابھارتا ہے۔ جس طرح مطرب کا گیت شراب پینے پر ابھارتا ہے۔
شکر پستانِ نعمت کو چوسنا ہے۔ پستان اگر بھرے ہوئے ہوں، جب تک تو چوسے نہیں دودھ نہیں آتا۔

اللہ کے ولی کا اپنی ذات کے متعلق کیا گمان ہوتا ہے

مولانا روم فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا، ہر ولی اور ہر بزرگ کو یہ گمان ہوتا ہے کہ خدا سے جو قُرب مجھے حاصل ہے کسی اور کو حاصل نہیں، اور خدا کی وہ عنایت جو مجھ پر ہے، کسی دوسرے پر نہیں۔ فرمایا، یہ خبر کس نے دی؟ ولی نے یا غیر ولی نے؟ اگر یہ خبر ولی نے دی تو جیسا کہ وہ جانتا ہے، ہر ولی کا اپنے حق میں یہی اعتقاد ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عنایت اس سے مخصوص نہیں ہوگی۔ اور اگر یہ خبر کسی غیر ولی نے دی تو وہ الحقیقت ولی ہے اور خدا کا خاص مقرب ہے، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے یہ راز تمام اولیاء سے چھپایا لیکن اس سے مخفی نہ رکھا۔ اس آدمی نے ایک مثال بیان کی کہ ایک بادشاہ کی دس لونڈیاں تھیں۔ ان سب لونڈیوں نے کہ ہم سب یہ چاہتی ہیں کہ معلوم کریں کہ بادشاہ کے نزدیک ہم میں سے محبوب ترین لونڈی کون سی ہے؟ بادشاہ نے فرمایا کل یہ انگوٹھی جس کے گھر میں ہوگی۔ وہی محبوب ترین لونڈی ہوگی۔ دوسرے دن بادشاہ نے فرمایا، اس انگھوٹھی جیسی دس انگوٹھیاں بنائی جائیں اور اس نے ہر لونڈی کو (چپکے سے) ایک انگوٹھی دے دی۔ فرمایا کہ سوال ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور یہ جواب نہیں ہے۔ اور اس سے تعلق نہیں رُکتا۔ یہ خبر ان دس لونڈیوں میں سے ایک نے بتائی کہ بادشاہ نے دس انگوٹھیاں بنوا کر ہر لونڈی کو ایک انگوٹھی دے دی۔ یا ان دس لونڈیوں کے علاوہ کسی نے؟ اگر ان دس لونڈیوں میں سے کسی ایک لونڈی نے بتائی تو اس نے سمجھ لیا کہ جب یہ انگوٹھی اس سے مخصوص نہیں ہے اور ہر لونڈی کے پاس ویسی انگوٹھی ہے تو بادشاہ کا خاص رجحان اس کی طرف نہیں۔ اور وہ محبوب ترین لونڈی نہیں۔ اگر یہ خبر ان دس لونڈیوں کے علاوہ کسی اور نے بتائی ہے تو وہ خود بادشاہ کی خاص اور محبوب ترین لونڈی ہے۔

گفتگو کی صلاحیت روشنی کا سرچشمہ ہے

مولانا رومؒ سے ایک مرتبہ اس شعر کے معنی پوچھے گئے :

اے برادر تو ہماں اندیشۂ
ما بقی تو استخوان و ریشۂ

تو آپ نے فرمایا تو اس معنی پر نظر کر کہ سب اندیشے اس مخصوص فکر کا اشارہ ہیں اور ہم نے اس کو وسعت کی خاطر تعبیر کیا ہے ۔ ورنہ درحقیقت وہ اندیشہ نہیں ہے۔ لفظ ''اندیشہ'' سے ہماری مراد یہ معنی تھا اور اگر کوئی شخص عوام کو سمجھانے کے لیے اس معنی کی تاویل کرنی چاہے تو کہہ دے :

الانسان حیوان ناطق. انسان حیوان ناطق ہے۔

اور نطق اندیشہ ہے خواہ وہ چھپا ہوا ہو اور خواہ وہ ظاہر ہو اور اس کے بغیر وہ حیوان ہوتا ہے۔ پس یہ صحیح ہے کہ انسان عبارت ہے اندیشہ سے، باقی ہڈی اور پٹھا ہے۔ کلام آفتاب کی طرح ہے۔ تمام انسان اس سے گرم اور زندہ ہیں اور آفتاب دائمی ہے اور موجود ہے اور حاضر ہے اور سب اس سے ہمیشہ گرم رہتے ہیں۔ البتہ آفتاب نظر نہیں آتا اور وہ نہیں جانتے کہ اس سے زندہ ہیں اور گرم ہیں۔ لیکن جب لفظ اور عبارت کے ذریعہ سے شکریہ ادا کیا جائے ، شکایت کی جائے یا خیر اور شر کا اظہار کیا جائے تو آفتاب نظر آتا ہے۔ جس طرح آفتاب فلکی ہے کہ ہمیشہ روشن ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ جب تک اس کی شعاع دیوار کو روشن نہیں کر دیتی ۔ اس طرح جب تک حرف اور ہوا کا ذریعہ نہ ہو، آفتابِ سخن کی شعاع پیدا نہیں ہوتی ۔ اگر چہ وہ دائماً موجود ہے۔ اس لیے کہ آفتاب لطیف ہے۔

کثافت چاہیے تاکہ اس کثافت کے ذریعے سے وہ نظر آئے اور ظاہر ہو۔ ایک شخص

نے کہا: خدا نے اسے کوئی معنی نہیں دکھائے اور خیرہ اور افسردہ رہا۔ جیسا کہتے ہیں خدا نے ایسا کیا اور ایسے فرمایا اور یوں منع کیا، گرم ہوا اور دیکھا۔ پس لطافت حق اگرچہ موجود تھی اور اس پر تاباں ہوئی مگر نظر نہ آئی۔ جب تک اس کے امر، نہی، خلق، قدرت سے اس اس کی شرح نہ کریں، اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ بعض لوگ ہیں جن کے پاس ضعف کی وجہ سے شہد کی طاقت نہیں، تا کہ اس کے ذریعے کھانا مثلاً زردہ، حلوہ وغیرہ کھا سکیں، تا کہ قوت ایسے مقام تک پہنچ جائے کہ شہد کو بلا واسطہ کھا سکیں۔ پس ہم نے سمجھ لیا کہ نطق ایک آفتاب ہے جو لطیف ہے اور ہمیشہ روشن ہے۔ اس کی روشنی کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ البتہ تُو کثیف ذریعے کا محتاج ہے، تا کہ آفتاب کی روشنی کو دیکھ سکے اور اس کا مزا اٹھا سکے۔ جب تو اس مقام پر پہنچ جائے کہ لطافت کو کثافت کے بغیر دیکھ لے اور تو اس کا عادی ہو جائے اور اس کے دیکھنے میں دلیر ہو جائے اور تو قوت پکڑ لے، تو اس وقت تو اس دریا کے عین درمیان میں ہوگا اور عجیب رنگ اور عجیب تماشے دیکھے گا۔ اور تجھے تعجب ہوگا کہ وہ نطق تجھ میں ہمیشہ کے لیے ہے خواہ تو بولے اور خواہ نہ بولے اور اگرچہ تیرے اندیشہ میں بھی نطق نہ ہو۔ اس گھڑی ہم کہتے ہیں کہ نطق ہمیشہ کے لیے ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں: ''الانسان حیوان ناطق''۔

یہ حیوانیت تجھ میں دائمی ہے۔ جب تک زندہ حیوانیت تجھ میں ہے، اسی طرح لازم آتا ہے کہ نطق بھی تیرے ساتھ دائمی ہو۔ اسی طرح چبانا ظہور انسانیت کا موجب ہے۔ انسانیت کی شرط نہیں پھر اسی طرح بات کرنا اور شور مچانا نطق کا موجب ہے۔ نطق کی شرط نہیں۔

انسان اپنے افعال کا خالق خود نہیں ہے

مولانا اس کی عُقدہ کشائی کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں پہلے جو ہم نے شعر کہا تو ایک بڑی خواہش تھی جو اس کے کہنے کا موجب تھی۔ اس وقت اس میں اثر تھا۔ اس گھڑی خواہش سست ہو چکی ہے اور رُو بہ زوال ہے۔ اس وقت بھی اس میں اثر ہے۔ خداوند تعالیٰ کی سنت ایسی ہے کہ وہ ہر چیز کی ابتداء کے وقت اس کی تربیت فرماتا ہے اور اس سے بہت بڑا اثر اور بڑی حکمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے زوال کے وقت بھی یہ تربیت قائم ہوتی ہے:

رب المشرق والمغرب. مشرق اور مغرب کا رب۔

یعنی رب المشرق والمغرب کے معنی یہ ہیں کہ وہ طلوع اور غروب ہونے والے اسباب کی تربیت کرتا ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ افعال کا خالق بندہ ہے اور ہر فعل جو اس سے صادر ہوتا ہے، بندہ اس کا خالق ہے۔ مناسب نہیں کہ ایسا ہو۔ اس لیے کہ وہ فعل جو اس سے صادر ہوتا ہے یا اس آلہ کے ذریعے سے جو وہ رکھتا ہے، مثلاً عقل، روح، قوت، جسم یا ذریعہ کے بغیر ہی مناسب نہیں کہ وہ افعال کا خالق ہو۔ اس لیے کہ وہ ان کی جمعیت پر قادر نہیں ہے۔ پس اس آلہ کے ذریعے وہ خالق افعال نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آلہ اس کا محکوم نہیں اور نہ مناسب نہیں کہ اس آلہ کے بغیر وہ خالق فعل ہو۔ اس لیے کہ ناممکن ہے اس آلہ کے بغیر اس سے فعل سرزد ہو۔ پس علی الاطلاق ہم نے سمجھ لیا کہ خالق افعال کا خدا ہے بندہ نہیں۔ ہر فعل خیر ہو یا شر ہو جو بندہ سے صادر ہوتا ہے، وہ اسے کسی نیت یا دل کے ارادہ سے کرتا ہے لیکن اس کام کی حکمت صرف اسی قدر نہیں ہوتی جو اس کے تصور میں آتی ہے۔ اس قدر معنی، حکمت اور فائدہ جو اس کے اس کام سے ظاہر ہے، اسی قدر تھا کہ اس سے وہ فعل وجود میں آ گیا۔ لیکن کلی فائدہ کو خدا ہی

جانتا ہے۔ کہ اس سے کیا پھل ملیں گے۔ مثلاً نماز پڑھتا ہے اس نیت سے کہ تجھے ثواب ہو آخرت میں اور نیک نامی اور امان ملے دنیا میں لیکن اس نماز کا فائدہ اس قدر نہیں ہوگا۔ سو ہزار فائدے ہوگے جو تیرے وہم میں بھی نہ آئیں۔ ان فائدوں کو خدا جانتا ہے کیونکہ اس ذات نے بندے کو اس کام پر لگا رکھا ہے۔ اب خدا کی قدرت میں انسان کمان کی طرح ہے اور خداوند تعالیٰ اسے کاموں میں استعمال کرتا ہے اور فاعل دراصل خدا ہے نہ کہ کمان۔ کمان آلہ ہے اور ذریعہ ہے۔ لیکن قوام دنیا کے اعتبار سے وہ خدا سے بے خبر اور غافل ہے۔ آفریں ہے اس عظیم کمان کو جو آگاہ ہو کہ میں کس کے ہاتھ میں ہوں۔ میں دنیا کو کیا کہوں۔ کیونکہ اس کا تو قوام اور ستون ہی غفلت ہے۔ اور کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب کسی کو دنیا سے بیدا کرتے ہیں تو وہ بیزار اور سرد ہو جاتا ہے اور گداز ہو جاتا ہے اور تلف ہو جاتا ہے۔ آدمی نے چھوٹی عمر سے جو نشو ونما اور بڑھوتری پائی ہے وہ غفلت ہی کے ذریعے پائی ہے ورنہ وہ ہر گز نہ پھلتا پھولتا اور نہ بڑا ہوتا۔ پس جب وہ غفلت کے ذریعہ سے بڑا ہوا۔ اور پھر خداوند تعالیٰ کی خاطر جبراً اور اختیاری طور پر اس نے مجاہدے کیے اور تکلیفیں برداشت کیں، تاکہ ان غفلتوں کو وہ اس سے دھوڈالے اور اسے پاک کردے۔ اس کے بعد وہ اس عالم سے آشنا ہوسکتا ہے۔ آدمی کا وجود مزبلہ کی مثال ہے جو کہ گوبر کا ٹیلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس گوبر کے ٹیلے کو عزیز رکھتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس میں بادشاہ کی انگوٹھی ہے۔ اور آدمی کا وجود گندم کا جوال ہے۔ بادشاہ آواز دیتا ہے کہ تو اس گندم کو کہاں لیے جاتا ہے؟ کہ میرا پیمانہ اس میں ہے۔ وہ پیمانہ سے غافل ہے اور گندم میں غرق ہے۔ اگر پیمانے سے واقف ہوتا تو گندم سے کب التفات کرتا۔ اب ہر خدشہ جو تجھے عالم علوی کی طرف کھینچتا ہے اور عالمِ سفلی کی طرف سے سرد اور سُست کرتا ہے، اس پیمانہ کا عکس اور پرتو ہے جو وہ باہر ڈالتا ہے۔ آدمی اس عالم کے درمیان میلان کرتا ہے اور جب اس کے برعکس عالمِ سفلی کی طرف مائل ہوتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ پیمانہ پردہ میں چھپ چکا ہے۔

وصال اور مفارقت ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں

کسی طالب حق نے حضرت مولانا روم رحمتہ اللہ سے دریافت کیا کہ سرکار رسالت مآب حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اس عظمت کے ہوتے ہوئے کہ:

لو لا ک لما خلقت الافلاک۔ اے پیغمبر! اگر تجھے پیدا نہ کرتا تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

ارشاد فرمایا ہے:

یالیت ربَ محمدِ لم یخلق محمدًا۔ کاش ربِ محمد نے محمدؐ کو پیدا نہ کیا ہوتا۔

یہ کیسے ہوا؟

مولانا نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: بات مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔ میں اس کی مثال بیان کرتا ہوں تا کہ تجھے معلوم ہو جائے۔ فرمایا کہ ایک گاؤں میں ایک مرد کسی عورت پر عاشق ہو گیا۔ دونوں کا مکان اور خیمہ قریب قریب تھا۔ انھوں نے خوب دادِ عیش دی۔ خوب موٹے تازے ہوئے اور پھلے پھولے۔ ان کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ تھی، جس طرح مچھلی صرف پانی ہی میں زندہ رہتی ہے۔ کئی سال یہ اسی طرح اکٹھے رہے۔ خداوند تعالیٰ نے ناگہاں انھیں امیر بنا دیا۔ بہت ساری بھیڑیں، گائیں، گھوڑے، مال وزر، جاہ و حشم اور غلام عطا کیے۔ انتہائی جاہ و حشم اور تنعم سے انھوں نے شہر کا قصد کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے بہت بڑا شاہی مکان خریدا۔ اور خیل و حشم سے اپنے اپنے مکان میں نزول فرما ہوئے۔ یہ شہر کے ایک کنارے پر تھا اور وہ دوسرے کنارے پر تھی۔ جب حالت یہاں تک

پہنچی تو وہ عیش اور وصل قائم نہ رہ سکا۔ ان کا دل اندر ہی اندر جلتا، چھپ چھپ کر وہ گریہ و زاری کرتے۔ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کا امکان نہ رہا۔ سوزِ عشق انتہا کو پہنچ گیا اور آتش نے ان کو پورے طور پر جلا ڈالا۔ جب سوز بالکل انتہا کو پہنچ گیا تو ان کے نالے کو قبولیت حاصل ہوئی۔ گھوڑے اور بھیڑیں کم ہونی شروع ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ انھیں اسی حالت پر لے آیا۔ لمبی مدت کے بعد وہ پھر اسی گاؤں میں اکٹھے ہوئے اور عیش اور وصل وکنار میں مشغول ہوگئے۔ فراق کی تلخی کو انھوں نے یاد کیا تو آواز آئی کہ

یالیت رب محمد لم یخلق محمدا۔ کاش رب محمد نے محمدؐ کو پیدا نہ کیا ہوتا۔

جب محمد ﷺ کی جان عالمِ قدس میں تنہا تھی تو وہ وصل حق سے بار آور تھی۔ وہ اس دریائے رحمت میں مچھلی کی طرح غوطے کھاتی تھی۔ ہر چند کہ آپ کو اس دنیا میں پیغمبری کا مقام، خلقت کی راہنمائی، عظمت، بادشاہی، شہرت اور صحابہ نصیب ہوئے۔ جب آپ پہلے عیش کی طرف دوبارہ لوٹے تو کہا اے کاش میں پیغمبر نہ ہوتا اور اس دنیا میں نہ آتا کیونکہ اس وصالِ مطلق کے مقابلے میں یہ سب ایک بوجھ اور عذاب اور مصیبت ہے۔ استحقاق اور عظمت باری تعالیٰ کے مقابلے میں یہ علم اور مجاہدہ اور بندگی ایسی رہی ہے جیسے ایک آدمی نے تیری اطاعت کی، خدمت کی اور چلا گیا۔ اگر تو خدمتِ حق میں ساری زمین کو سر پر رکھ لے تو ایسا ہے کہ تو نے ایک مرتبہ سجدہ کیا۔ کیونکہ خدا کا استحقاق اور اس کا لطف مسابقت رکھتا ہے تیرے وجود اور تیری خدمت پر۔ تجھے وہ کہاں سے باہر لایا اور موجود کیا؟ اور تجھے بندگی اور خدمت کے لیے مستعد کیا تاکہ تو اس کی بندگی کی لاف مار سکے۔ یہ بندگیاں اور علوم ایسے ہیں گویا تو نے لکڑی اور نمدہ سے شکلیں بنائیں اور اس کے بعد تو نے وہ اس کے حضور میں پیش کردیں کہ یہ شکلیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں نے بنا ڈالیں۔ لیکن ان میں جان ڈالنا تیرا کام ہے۔ اگر تو انھیں جان ارزانی فرمائے تو میرا علم زندہ کردے گا۔ اور اگر تو ان میں جان نہ ڈالے تو یہ بھی تیرا ہی فرمان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا خدا وہ ہے:

يُحيِ و يميت.　　　وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔

نمرود نے کہا:

اَنَا اُحيِ و اُميت.　　　میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔

جب خداوند نے اسے ملک دیا تو اس نے بھی اپنے آپ کو قادر سمجھا، اپنے آپ کو خدا کے حوالے نہ کیا اور کہنے لگا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اس ملک سے میری مراد عقل ہے۔ جب خداوند آدمی کو علم، زیرکی اور حذاقت عطا کرتا ہے، تو وہ خود ہی کاموں میں اضافہ کر دیتا ہے کہ میں اس عمل اور اس کام سے کارناموں کو زندہ کرتا ہوں اور ذوق حاصل کرتا ہوں۔ کہا، نہیں!

وهو يحيِ ويميت.　　　وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔

اس دنیا میں کفر کا وجود بھی ناگزیر ہے

مولانا مرحوم کے ایک شعر کا مفہوم ہے

کفر اور دین دونوں ہی تیرے راستے میں دوڑ رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ خدا واحد ہے، اس کا کوئی شرک نہیں۔

اس گھر کی اساس و بنیاد غفلت پر مبنی ہے اور اجسام اور عالم کا سب قوام غفلت سے ہے۔ یہ جسم جو پھلتا پھولتا ہے، یہ بھی غفلت ہی سے ہے۔ اور غفلت کفر ہے اور کفر کے وجود کے بغیر دین ممکن ہے۔ اس لیے کہ دین ترکِ کفر ہے۔ پس چاہیے کہ ایک کفر ہو جسے ترک کیا جا سکے۔ پس ہر دو ایک ہی چیز ہیں کیونکہ یہ اس کے بغیر نہیں اور وہ اس کے بغیر نہیں۔ یہ ایک دوسرے کا لازمی جز ہیں۔ اور ان کا ایک ہی خالق ہے کیونکہ اگر ان کا خالق ایک نہ ہوتا تو یہ علیحدہ علیحدہ جز ہوتے۔ اس لیے کہ تو جو چیز پیدا کرتا ہے، وہ علیحدہ علیحدہ جزو ہوتے ہیں۔ پس جب خالق ایک ہے تو وہ وحدہٗ لاشریک ہوا۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے

مولانا فرماتے ہیں کہ نجومی کہتا ہے، تمھارا دعویٰ ہے کہ جن افلاک اور کرہ خاکی کو میں دیکھتا ہوں، ان سے باہر کوئی چیز موجود ہے۔ میرے سامنے ان کے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اگر وہ ہے تو مجھے دکھاؤ کہ وہ کہاں ہے؟

فرمایا کہ یہ سوال ابتداء ہی سے لایعنی ہے۔ اس لیے کہ تو کہتا ہے دکھاؤ وہ کہاں ہے ؟ اور اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد آ اور بتا کہ تیرا اعتراض کہاں ہے؟ اور کس جگہ میں ہے۔ وہ زبان میں نہیں ہے۔ سینہ میں نہیں ہے۔ ان سب کو ریشہ ریشہ، ٹکڑے ٹکڑے اور ذرّہ ذرّہ کردے۔ دیکھ کہ اس اعتراض اور فکر کو تو ان سب میں کہیں پاتا ہے؟ پس ہم نے سمجھ لیا کہ تیرے فکر کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جب تو اپنے فکر کی جگہ کو نہ سمجھا تو فکر کو پیدا کرنے والے کی جگہ کو کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ اتنے ہزار افکار اور حالات تجھ پر وارد ہوتے ہیں، وہ تیرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ وہ تیرے مقدور میں نہیں ہیں۔ تیرے محکوم نہیں ہیں۔ اور اگر ان کے طلوع ہونے کے مقام کو تو جانے کہ وہ کہاں ہے تو انھیں زیادہ کردے۔ ان تمام چیزوں کی گزرگاہ تو ہے اور تجھے خبر نہیں ہے کہ کہاں سے آتی ہیں اور کہاں جاتی ہیں اور کیا کریں گی؟ جب تو اپنی حالت کے متعلق مطلع ہونے سے عاجز ہے تو تُو کس طرح توقع رکھتا ہے کہ اپنے خالق کے متعلق مطلع ہو؟ بیسوا کہتی ہے کہ وہ آسمان میں نہیں ہے۔ اے کتیا! تُو کیسے جانتی ہے کہ نہیں ہے؟ ہاں تو نے آسمان کا چپا چپا چھان مارا ہے، اس کے بعد توجہ دیتی ہے کہ اس میں نہیں ہے اپنی بیسوا کو جسے تو گھر میں رکھتا ہے، تو نہیں جانتا تو آسمان کو تو کیسے جانے گا؟ ارے تو نے آسمان اور تاروں کا نام سن لیا ہے اور افلاک کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔ اگر تجھے آسمان کی اطلاع ہوتی یا تو آسمان کی طرف گیا ہوتا تو یہ ہرزہ سرائی نہ کرتا۔ یہ

جو ہم کہتے ہیں کہ خدا آسمان پر نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ آسمان پر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اس پر محیط نہیں ہے بلکہ وہ آسمان پر محیط ہے۔ وہ بے چون و چگونہ ہے۔ آسمان سے اس کا تعلق اسی طرح سے بے چون و چگونہ ہے۔ سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور ہر چیز اس کی مظہر ہے۔ اور اس کے تصرف میں ہے۔ پس وہ آسمان اور اکوان (کون کی جمع) سے باہر نہیں۔ اور وہ پورے طور پر ان کے اندر بھی نہیں۔ یعنی یہ اس پر محیط نہیں ہیں، اور وہ سب پر محیط ہے۔

ڈر اور خشیت بھی حکمت سے خالی نہیں

مولانا فرماتے ہیں کہ ایک شخص کی انگشتری کہیں کھو گئی۔ اگر چہ اُسے وہاں سے چور لے گئے، وہ شخص اسی جگہ کے گرد گھومتا رہا کہ میں نے یہاں انگوٹھی گم کی ہے۔ اسی طرح صاحب تعزیت قبر کے گرد گھومتا ہے۔ وہ بے خبر ہو کر مٹی کے ڈھیر کا طواف کرتا اور اسے چومتا ہے، یعنی کہ وہ انگوٹھی میں نے یہیں گم کی ہے۔ اسے یہاں کیسے چھوڑ دوں! خداوند تعالیٰ نے اتنی کاریگری کے ساتھ اپنی قدرت کا اظہار فرمایا کہ اس نے ایک دن دو روحوں کو ایک قالب میں حکمت الٰہی کے لیے ایک جگہ کر دیا۔ آدمی اگر جسم کے ساتھ لحد میں ایک لحہ بھی بیٹھے تو خوف یہ ہے کہ وہ دیوانہ ہو جائے۔ پس وہ کس طرح صورت کے دام اور قالب کی خندق سے کودے۔ وہاں کیسے رہے؟ خداوند تعالیٰ نے انھی دلوں کی تخویف اور تخویف کی تجدید کے لیے ایک نشان بنایا ہے، تا کہ قبر کی وحشت اور خاک تیرہ سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو۔ جیسے راستے میں جب قافلہ کو کسی جگہ لوٹ لیتے ہیں تو لٹنے والے نشان کے لیے دو تین پتھر اوپر تلے وہاں رکھ دیتے ہیں کہ یہ خطرے کا مقام ہے۔ یہ قبریں بھی اس طرح خطرے کی جگہ کے لیے نشاناتِ محسوس ہیں۔ وہ خوف بھی ان میں اثر کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ عمل میں لائیں۔ مثلاً اگر کہیں کہ فلاں آدمی آپ سے ڈرتا ہے تو بغیر اس کے کہ اس سے کوئی فعل صادر ہو۔ تجھے اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے برعکس کہہ دیں کہ فلاں آدمی تجھ سے بالکل بھی نہیں ڈرتا اور اس کے دل میں تیری ہیبت نہیں۔ تو تنہا یہی بات تیرے دل میں اس کے متعلق غصہ پیدا کر دیتی ہے۔

یہ بھاگنا خوف کا اثر ہے۔ تمام عالم بھاگتا ہے۔ البتہ ہر کسی کا بھاگنا اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کے لیے اور قسم کا، نباتات کے لیے اور قسم کا، اور روح کے لیے

اور قسم کا۔ روح کا دوڑنا بغیر قدم اور نقصان کے ہے۔ کچے انگور کو دیکھو کہ اس نے کتنی تگ ودو کی جب کہیں جا کر وہ پختہ انگور کے مقام تک پہنچا، اور اس میں مٹھاس پیدا ہوئی۔ فی الحال اس کی پہلی منزل یہی تھی۔ وہاں تک پہنچ گیا۔ البتہ وہ دوڑتا نظر نہیں آتا اور محسوس نہیں ہوتا۔ ہاں جب وہ اس مقام تک پہنچ جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بہت دوڑا ہے، جب جا کر وہاں پہنچا ہے۔ جیسے کوئی شخص پانی میں اترا اور کسی نے اس کا اترنا نہ دیکھا۔ جب اس نے اچانک پانی سے سر باہر نکالا تو معلوم ہوا کہ وہ پانی میں اترا تھا کہ وہ یہاں پہنچ گیا۔

مولانا روم کی نظر میں اسباب کی حقیقت

مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ آدمی اگر چہ غافل ہے، دوسرے اس سے غافل نہیں ہیں۔ انسان جس قدر دنیا کے کام میں زیادہ جدو جہد کرتا ہے، اتنا ہی حقیقت کار سے غافل ہو جاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی رضا طلب کرنی چاہیے نہ کہ خلق کی رضا۔ کیونکہ دنیا کی رضا، محبت اور شفقت مستعار ہے اور خدا نے عاریتاً دے رکھی ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو جمعیت اور ذوق نہیں دیتا۔ نعمت، نان اور تنعّمات کے اسباب، تکلیف اور مشقت بن کر رہ جاتے ہیں۔ پس تمام اسباب، قلم کی طرح قدرتِ حق کے ہاتھ میں ہیں۔ حرکت دینے والا اور لکھنے والا دراصل خداوند تعالیٰ ہے۔ جب تک وہ نہ چاہے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اب تو قلم پر نظر کرتا ہے، تو کہتا ہے کہ اس قلم کے لیے ایک ہاتھ چاہیے۔ تو قلم کو دیکھتا ہے۔ ہاتھ تجھے نظر نہیں آتا۔ قلم کو دیکھتا ہے تو ہاتھ یاد آ جاتا ہے۔ وہ کیا ہے جسے تو دیکھتا اور جو کچھ تو کہتا ہے لیکن یہ ہمیشہ ہاتھ کو دیکھتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جب تو ہاتھ ہے تو قلم بھی چاہیے۔ بلکہ خوبی دست کے مطالعے کی وجہ سے انھیں مطالعہ قلم کی پروا نہیں ہوتی، اور کہتے ہیں کہ ایسا ہاتھ بغیر قلم کے نہیں ہوتا۔ جب تجھے مطالعۂ قلم میں ایسی حلاوت ملتی ہے کہ تجھے ہاتھ کی پروا نہیں رہتی تو انھیں اس ہاتھ کے مطالعہ میں حلاوت ملتی ہے اس کے ہوتے ہوئے انھیں قلم کی حاجت کیسے ہو؟ جب تجھے جو کی روٹی میں حلاوت ملتی ہے، تو گندم کی روٹی کیسے یاد آئے؟ جب اس نے تجھے زمین پر ایک رزق بخش دیا تو تو آسمان کی خواہش نہیں رکھتا۔ حالانکہ اصل محلِ رزق آسمان ہی ہے۔ اور زمین خود آسمان سے زندگی پاتی ہے۔ بھلا اہلِ آسمان زمین کو کیا یاد کریں! اب خوشیوں اور لذتوں کو ان کے اسباب سے نہ دیکھ۔ کیونکہ اسباب کو وہ حقیقت مستعار ملی ہے۔ کیونکہ:

وھو الضار و النافع۔ وہی ضرر پہنچانے والا ہے اور وہی نفع دینے والا ہے۔

جب ضرر اور نفع اسی کی طرف سے ہے تو اسباب پر کیوں چپکتا ہے؟

خیر الکلام ماقلّ ودل. بہترین کلام وہ ہے جو قلیل ہو اور مدلل ہو۔

بہترین بات وہ ہے جو مفید ہو نہ کہ زیادہ ہو۔

قل ھو اللہ احد. کہہ اللہ ایک ہے۔

بظاہر ایک چھوٹی سورت ہے۔ لیکن افادیت کے اعتبار سے سورۃ بقرۃ پر فوقیت رکھتی ہے۔ اگرچہ سورہ بقرۃ طویل ہے۔ حضرت نوحؑ نے ہزار برس دعوتِ حق دی۔ اس پر چالیس افراد نے اس کی پیروی کی۔ ظاہر ہے کہ جنابِ محمد مصطفےٰ ﷺ کو کتنا عرصہ دعوتِ حق کے لیے ملا، اس میں کتنے ممالک ان پر ایمان لے آئے۔ ان میں سے کتنے اولیاء اوراوتاد ظاہر ہوئے۔ پس معتبر نہ زیادتی ہے نہ کمی۔ اصل مطلب افادیت سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی مختصر سی بات لمبی بات سے زیادہ مفید ہو۔ یہ ایسا ہی ہے کہ تنور کی آگ جب انتہائی طور پر زیادہ تیز ہو تو اس سے فائدہ نہیں اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اور اس کے نزدیک نہیں جاسکتے۔ لیکن کمزور چراغ سے تو ہزاروں فائدے اٹھاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقصود فائدہ ہے، بعض کے لیے یہی مفید ہے کہ وہ بات سنیں، وہ صرف دیکھیں۔ ان کا دیکھنا ہی بہت ہے اور ان کے لیے نفع مند ہے۔ اگر وہ بات سن لیں تو انھیں کافی نقصان پہنچتا ہے۔

ہندوستان سے ایک بزرگ نے بہت لمبے سفر پر کمر باندھی۔ جب وہ تبریز میں داخل ہوئے تو شیخ کے مکان تک جا پہنچے۔ کنجِ مکان کے اندر سے آواز آئی کہ واپس لوٹ جا۔ تیرے حق میں اتنا ہی نفع ہے کہ تو اس دروازے تک پہنچ گیا۔ اگر تو شیخ کو دیکھ لے تو تجھے نقصان ہوگا۔ تھوڑی مگر مفید بات ایسی ہی ہے جیسے ایک چراغ روشن نے ایک ناروشن چراغ کو بوسہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے حق میں اتنا ہی بہت ہے، اور وہ مقصود پہنچ گیا۔ نبی آخر وہ شکل نہیں ہے، شکل نبی کا گھوڑا ہے۔ نبی دراصل وہ عشق اور محبت ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ جس طرح حضرت صالح کی ناقہ، اس کی شکل ناقہ ہے۔ نبی وہ عشق اور محبت ہے

اور وہ جاودانی اور سرمدی ہے۔

ایک شخص نے کہا، منارہ پر صرف خدا ہی کی ثنا کیوں نہیں کی جاتی؟ محمد ﷺ کو بھی یاد کرتے ہیں۔

اس سے کہنے لگے کہ آخر محمد ﷺ کی تعریف خدا کی تعریف ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کہتا ہے، خدا بادشاہ کو لمبی عمر دے۔ اور اس شخص کو کہ جس نے مجھے بادشاہی تک پہنچنے کا راستہ بتایا، یا جس نے مجھے بادشاہ کا نام اور اس کے اوصاف بتائے۔ اب اس کی تعریف درحقیقت بادشاہ کی تعریف ہوئی۔

نبی یہ کہتا ہے کہ مجھے کوئی چیز دو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اپنا جبہ مجھے دے یا مال یا اپنا کپڑا مجھے دے۔ بھلا وہ جبہ اور مال کو کیا کرے گا؟ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ تیرا لباس ہلکا کر دے تاکہ آفتاب کی گرمی تجھ تک پہنچے۔ کیونکہ:

اقرضوا الله قرضاً حسناً. (سورۂ حدید) اللہ کو قرض حسنہ دو۔

وہ صرف مال اور جبہ ہی نہیں چاہتا۔ مال کے علاوہ بھی اس نے تجھے بہت چیزیں دے رکھی ہیں۔ علم اور فکر، اور عقل اور نظر۔ مطلب یہ کہ گھڑی بھر نظر، فکر، سوچ اور عقل کو میرے لیے صرف کر۔ آخر تو نے مال انھی حالات سے حاصل کیا ہے۔ جو میں نے تجھے دیے ہیں۔ وہ پرندوں سے بھی اور جال سے بھی صدقہ چاہتا ہے۔ اگر تو آفتاب کے سامنے برہنہ ہو سکے تو بہتر ہے کیونکہ وہ آفتاب تجھے سیاہ نہیں کرتا بلکہ سفید کرتا ہے۔ کپڑوں کو تو ایک بار ہلکا کر دے۔ تاکہ تو آفتاب کا ذوق دیکھے۔ ایک مدت تک تو ترشی کا عادی رہا۔ اب ایک مرتبہ شیرینی کو آزما دیکھ۔

سائے کو جسم سے کیا نسبت ہوتی ہے؟

مولانا فرماتے ہیں کہ بہت عورتیں ہوتی ہیں جو حجاب میں رہتی ہیں، لیکن وہ اپنا چہرہ کھول دیتی ہیں تاکہ کوئی مطلوب اپنے آپ کو آزمائے، جس طرح تو استرے کو آزماتا ہے۔ اور عاشق معشوق سے کہتا ہے، میں نہ سویا ہوں، نہ میں نے کچھ کھایا ہے۔ اور میں تیرے بغیر ایسے ہو گیا اور ویسے ہو گیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ تجھے ظاہر کرنے والے کی طلب ہے۔ تجھے ظاہر کرنے والا میں ہوں، تاکہ تو دو معشوقوں کے پاس اپنے آپ کو فروخت کرے۔ اور اسی طرح سب علماء اور ہنر مند ظاہر کرنے والے کو طلب کرتے ہیں:

كُنتُ كَنزاً مخفياً فَاَحْبَبْتُ ان اعرف. میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے پسند کیا کہ پہچانا جاؤں۔

اس نے خلق کو اپنی صورت پر پیدا کیا یعنی اپنے احکام کی صورت پر۔ اس کے احکام سب خلق میں ظاہر ہوئے۔ اس لیے کہ سب ہی خدا کا سایہ ہیں۔ اور سایہ جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اگر پانچ انگلیاں کھول دی جائیں تو ان کا سایہ بھی کھل جاتا ہے۔ اگر کوئی رکوع میں جائے تو سایہ بھی رکوع میں جاتا ہے۔ اور اگر وہ دراز ہو تو سایہ بھی دراز ہوتا ہے۔ پس خلق ایک مطلوب ہے اور محبوب کی طالب ہے۔ کیونکہ وہ سب چاہتے ہیں کہ اس کے محب بنیں۔ اور اس کے سامنے عاجزی کرنے والے بنیں۔ اور اس کے دشمنوں کے دشمن اور دوستوں کے دوست بنیں۔ یہ سب خدا کے احکام اور صفات ہیں۔ جو وہ سایہ میں ظاہر کرتا

ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمارا سایہ ہم سے بےخبر ہے۔ لیکن ہم باخبر ہیں۔ تاہم ہماری یہ بےخبری خدا کے علم کی نسبت سے بےخبری کا حکم رکھتی ہے۔ جو کچھ جسم میں ہوتا ہے، وہ سب کا سب سایہ میں ظاہر نہیں ہوتا۔ صرف بعض چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ خدا کی ساری صفات ہمارے اس سایہ میں ظاہر نہیں۔ صرف بعض صفات ظاہر ہیں، کیونکہ:

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ ہم نے تم کو بہت ہی تھوڑا علم دیا ہے۔

(سورۂ بنی اسرائیل: ع ۱۰)

انتخاب نہج البلاغہ	ابو محمد مخدوم زادہ
شیر شاہ سوری	میاں عبدالرشید
تاریخ فرعون	خواجہ حسن نظامی
تذکرہ جنگ دہلی 1857ء	مبارک شاہ خان / مترجم ڈاکٹر سعود الحسن خان
تاریخ جنگ آزادیٔ ہند 1857ء	سید خورشید مصطفیٰ رضوی
انسائیکلوپیڈیا شخصیات جنگ آزادی 1857ء	ڈاکٹر سعود الحسن خان
تعمیر حیات	ڈیل کارنیگی / مترجم برزو جی فیروز شاہ
تعمیر زندگی	غلام حیدر خان
زندگی	چوہدری افضل حق
جینے کے انداز	آندرے موروا
جواہرات	چوہدری افضل حق
زندگی اور عمل	ڈاکٹر مارڈن
جادو بیانی	شاہ مراد بدایونی

بُک پبلشرز

5۔ یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0333-4394686 042-7241778